جذباتِ فطرت

معذرت

افسوس کہ ہر چند تلاش کیا مگر جلد کے واسطے حسب دلخواہ کپڑا دستیاب نہوا
بادل ناخواستہ پہلے اڈیشن میں کاغذی کی جلد پر اکتفا کرتے ہیں لیکن
انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ کپڑے کی مطلا جلدیں شایع ہونگی۔ بحالت موجودہ
قیمت میں بھی معقول تخفیف کر دی گئی ہے یعنی فی جلد عہ۸/ کے بجاے
صرف عہ۲/ قیمت رکھی ہے۔ کم از کم ۲۵ سٹ کے یکمشت خریدار کو فی سٹ ۶/
کمیشن دیا جائیگا۔ اس سے زیادہ رعایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سلسلۂ منتخباتِ نظمِ اُردو

جذباتِ فطرت

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مرتّبہ

محمد الیاس برنی ایم اے - ال ال بی (علیگ)
(سابق پروفیسر اکنامکس محمڈن کالج علی گڑھ)
معلّم معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

جلد اوّل

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ کالج میں طبع ہوئی ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء

بار اوّل ۱۰۰۰ جلد

قیمت فی جلد [illegible]

اُردو شاعری کی بھی عجب افتاد پڑی جب کہ ہندوستان میں اسلامی حکومتوں پر تباہی کی کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور گھڑی گھڑی ادبار کی بجلیاں گرتی تھیں، بزم سخن کی رونق اور چہل پہل قابل دید تھی۔ خود فرماں روائے وقت دنیا ومافیہا سے بے خبر شاعری کی دھن میں مست تھے۔ شاعروں کی دیکھا دیکھی حشرات الارض کی طرح بے شمار نظم نگار نکل پڑے۔ آٹھوں پہر مشاعرے گرم رہنے لگے اور مدّاحوں کی واہ واہ نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ رنگ رلیوں کا زمانہ تھا کلام بھی قدرتاً اسی رنگ میں رنگ گیا چنانچہ اس میں حُسن پرستی کا وہ ہیجان آیا اور عشق و عاشقی کا وہ طومار بندھا کہ خدا کی پناہ۔ اس زہریلے مذاق سے قوم پر کس درجہ مردنی چھائی، اخلاق و عادات کی کیا گت بنی، جاہ و ثروت کس طرح

خاک میں ملی، یہ عبرت ناک داستان ابھی تاریخ ہند میں بیان ہونی باقی ہے پھر بھی بڑی خیریت ہوئی کہ ظاہری آرایش کی کثرت سے شاعری کا اصلی حسن چھپا رہا۔ مبالغوں اور لفظی رعایتوں نے خود ہی اس آگ کے شعلے دبا دیے اگر کہیں اس رنگ میں جراًت، انشا، مرزا شوق، اور میاں نظیر کے طرز پر شاعری نے اپنا پورا پورا جلوہ دکھایا ہوتا تو پھر قیامت تھی۔ فحش اور مبتذل کلام سے تو بحث نہیں ان واسوختوں نے نہ معلوم کتنے نونہال جھُلس ڈالے۔ البتہ اس رنگ کے متین اور مہذّب کلام کو لیجیے۔ اس میں ہزار لفظی اور معنوی خوبیاں سہی لیکن تاثیر جو شاعری کی جان ہے کمیاب ہے۔

اگرچہ بہت سا کلام گردشِ ایّام کی نذر ہو گیا۔ تاہم اب بھی نظموں کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے اور خدا کا شکر ہے کہ جا بجا ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن کے پاکیزہ اور لطیف مضامین قوم کے واسطے مایۂ حیات اور سرمایۂ مباہات ہیں۔ جن کے بیان کی صفائی و حقیقت آمیزی اور جن کی زبان کی شگفتگی و بے ساختگی سے شاعری کی سحر کاریاں جلوہ گر ہیں ایسا کلام خود بخود قلب کو گرماتا اور روح کو

تڑپاتا ہے۔ سوتوں کو جگاتا اور ڈوبتوں کو تراتا ہے۔ ہنستوں کو رلاتا اور روتوں کو ہنساتا ہی۔ شاعری نے اس میں بلا کا اثر بھر دیا ہی کسی عارضی اور مصنوعی ذوق کے بجائے خود انسانی فطرت اس کی مقبولیت کی ضامن ہی اور نفسیات کے دربار سے اسی کو بقائے دوام کا فرمان ملا ہی۔

اشاعت ادب، ترقی زبان اور اصلاح تمدن کی ایک عمدہ سبیل یہ ہے کہ خاص خاص رنگ کا شاعرانہ کلام مرتب کرکے ناظرین کے روبرو پیش کیا جائے چنانچہ زندہ دل اور علم دوست قوموں میں ادبی خدمت کا یہ طریق بہت رائج اور مقبول ہی۔ آئے دن اچھے سے اچھے انتخابات شایع ہوتے رہتے ہیں اس ترکیب سے مطالعہ کا شوق بڑھتا ہی، ذوق سلیم پیدا ہوتا ہے اور شاعری اپنا کام کر دکھاتی ہی۔

کچھ انتخابات آج کل نصاب تعلیم میں داخل ہیں بعض شاعروں کا منتخب کلام بھی شایع ہو رہا ہی لیکن اب تک ایسے مسلسل اور مربوط انتخابات کا انتظار رہا جو ادبی مرقعوں کا کام دیں۔ بڑی ضرورت یہ ہی کہ شاعری کے

موجودہ رجحانات اور مقامات پیش نظر ہو جاویں تاکہ جو ادیب اور شاعر اپنی
ذمہ داریوں سے واقف ہوں شاعری کی اصلاح و ترقی کی معقول تجاویز
سوچیں اور کارگر تدابیر اختیار کریں۔ انتخابات سے پتہ چلا کہ ہماری شاعری کے
بہت سے شعبے توجہ طلب ہیں۔ مثلاً اب تک وہ دین و ملت سے بیگانہ بلکہ
برگشتہ رہی۔ حمد، نعت اور مناجات جن میں کچھ خلوص و نیاز کی چاشنی ہو مشکل
سے ملتی ہیں۔ اور قومی نظمیں تو بوجہ ندرت ابھی تک تبرک بنی ہوئی ہیں اسطرح
جذبات کو لیجیے۔ اوّل تو ایشیائی طبیعت یوں ہی حزن پسند ہی دوسرے
اُردو شاعری نے قومی تنزل اور تباہی کے دور میں ہوش سنبھالا قدرتاً
کلام بارد اور یاس انگیز ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، زمانہ کی گردش، تقدیر کی بندش
فتادگی و خود فراموشی، سکون و خاموشی، جب راگ کا یہ سرگم ہو تو پھر نا ممکن ہے
کہ اسے سن کر مال و دولت اور جاہ و حشمت سے دل بیزار نہ ہو۔ شاعری کی یہ
برودت ہماری جیسی مضمحل اور تساہل پسند قوم کے حق میں بہت خطرناک ہی
کہیں خدانخواستہ جدّ وجہد کے رہے سہے ولولے اور ترقی کی اُمنگیں پھر سرد

نہ پڑ جائیں اس وقت تو کچھ ایسے حار نسخہ کی ضرورت ہی جس سے دلوں کی افسردگی نکلے۔ اولوالعزمی اُبھرے اور لوگوں میں گرمجوشی پھیلے۔ اس طرح گرم سرد اجزار کی آمیزش سے خود بخود شاعری میں ایک صحت بخش اعتدال پیدا ہو جائیگا۔ علی ہذا قدرت کو لیجئے اس کے بے شمار عجائبات ہمیشہ سے آنکھوں کے سامنے موجود رہے۔ لیکن ہمارے شاعروں نے کہیں اب جاکر نقاشی شروع کی ہی اور ابھی وہ زمانہ دُور ہی جب کہ نیچر کی تصاویر مُنہ سے بولنے لگیں۔ حاصل کلام یہ کہ اُردو شاعری میں گوناگوں اصلاح و ترقی کی ضرورت و گنجایش ہی اور بحالت موجودہ غالباً انگریزی شاعری اس کام میں بہت زیادہ مدد دے سکتی ہی۔

اسی ضرورت کے خیال سے خدا کا نام لے کر ہم منتخبات نظم اُردو کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ مجانست مضامین کے لحاظ سے اس کے تین جداگانہ حصّے قرار پائے ہیں:

(۱) مَعارِفِ ملّت حمد، نعت، مناجات اور اخلاقی و قومی نظموں کا گلدستہ۔

(۲) جذباتِ فطرت۔ یہ مجموعہ غالبؔ مرحوم کے ایک لطیف انکشاف

فطرت کی شرح ہے؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(۳) مناظرِ قدرت۔ اوقات، مقامات، مخلوقات اور واقعات کی دلکش
تصاویر کا مرقع۔

ایسے وسیع انتخابات میں سب نظموں کا ادبی حیثیت سے ہم پلّہ ہونا نہ تو
ممکن ہے اور نہ مطلوب۔ چنانچہ اساتذہ کے کلام کے پہلو بہ پہلو نومشق اور غیر
معروف شاعروں کی طبع آزمائیاں درج ہیں لیکن شاعری کے رنگ و بو
سے کوئی نظم خالی نہیں۔ بعض نظمیں جو ادبی لحاظ سے شاید ادنیٰ خیال کی جائیں
اس لئے خاص طور پر قابلِ قدر ہیں کہ وہ پہلے پہل نئے نئے ضروری مضامین
کے صاف ستھرے خاکے بطور نمونہ پیش کرتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ بھی
بڑا کام ہے خدا جانے انہی کی دیکھا دیکھی آگے چل کر سحر نگار قلم کیسی کیسی

انوکھی اور پیاری تصاویر کھینچ دکھائیں۔ علاوہ بریں ارتقاء شاعری کی تحقیق میں بھی یہ نظمیں ناگزیر ہونگی۔ پھر کسی جامع انتخاب میں کیونکر نظر انداز ہو سکتی ہیں۔ اگر کچھ نظمیں بعض حضرات کے لطیف ادبی مذاق پر بار ہوں تو اُمید ہی کہ وہ معذرت قبول فرمائینگے باایںہمہ ان کی ضیافت طبع کے واسطے اساتذہ کا بھی کافی کلام موجود ہی۔ اگر انار کے کچھ دانے کچّے ہوں تو اس سے باقی انار کی شیرینی و لطافت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

انتخاب اور ترتیب کا طریق خود مجموعوں سے ظاہر ہی۔ اصل مضمون پیش نظر رکھکر نظموں سے غیر ضروری اجزا نکالنا، مفید مطلب مقامات چھانٹنا، حسب صلاحیت ان کو از سرِ نو ملانا یا جداگانہ نظموں کی شکل میں لانا پھر نظموں کے موزوں عنوانات قرار دے کر ان کو مضمون وار اس طرح ترتیب دینا کہ ہر نظم کا موقع محل ایک خاص موزونی اور معنی رکھتا ہو، یہ سب اہتمام کیا، تب کہیں اس سلسلۂ منتخبات کا ڈول پڑا۔ آیندہ جوں جوں موزوں کلام دستیاب ہوگا، ہر حصّہ کی متعدد جلدیں بتدریج شایع کی جائنگی

جو ساخت اور ضخامت کے لحاظ سے تقریباً یکساں ہونگی اُمید ہی کہ اس طرح پراُردو شاعری کا ایک وسیع انتخاب مرتّب ہو جائیگا۔ انشا ءاللہ تعالیٰ۔

جن شاعروں کے کلام سے دل و دماغ بلکہ روح کو تفریح و جلا ہوتی ہی ان کا پورا پورا شکریہ کوئی کس طرح ادا کرے۔ خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ آمین

جن حضرات نے مہربانی فرما کر نظموں کی فراہمی میں مدد دی، اس سلسلہ کی جلدوں کو اپنے قابلانہ مقدموں سے مزیّن فرمایا اور اس کی طباعت وغیرہ کا حسب دلخواہ اہتمام کیا مؤلف ان کا بھی بدل ممنون احسان ہی۔

ملک کو اُردو اور بالخصوص شاعری کو ایسے انتخابات سے جو فائدہ پہنچیگا اُس کے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ تجربہ خود بہت جلد ثابت کر دے گا اَلسَّعیُ مِنِّی وَالِاتمَامُ مِنَ اللہ ۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
جولائی ۱۹۱۹ء

الیاس برنی

جذباتِ فطرت

جلد اوّل

فہرست مضامین

ہر جلی عنوان سے ایک نیا مضمون شروع ہوتا ہے اور اسکے تحت مضامین متجانسہ درج ہیں۔

جلد اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جذباتِ فطرت

انشاطِ اُمید

اے مری اُمید مری جاں نواز
اے مری دل سوز مری کارساز

میری سپر اور مرے دل کی پناہ
درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ

عیش میں اور رنج میں میری شفیق
کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

کاٹنے والی غمِ ایّام کی
تھامنے والی دلِ ناکام کی

مد اول

دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ — تیرے دلاسہ سے ملا ہم کو سکھ

تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ — تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج — کھول دیئے تو نے قناعت کے گنج

تجھ سے ہی محتاج کا دل بے ہراس — تجھ سے ہی بیمار کو جینے کی آس

خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو — عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو

نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو — چاہ میں یوسف کے دل آرا تھی تو

رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تو — پانڈوں کے ساتھ پھری بن میں تو

تو نے سدا قیس کا بہلایا دل — تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل

ہو گیا فرہاد کا قصّہ تمام — پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام

ہوتی ہی تو پشت پہ ہمّت کے جب — مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

ہات میں جب آ کے لیا تو نے ہاتھ — سات سمندر سے گذرنا ہی بات

ساتھ ملا جس کو ترا دو قدم — کہتا ہے وہ یہ ہے عرب اور عجم

تو نے دیا آ کے ابھارا جہاں — سمجھے کہ مٹھی میں ہی سارا جہاں

ذرّے کو خورشید میں دے تو کھپا

بندے کو اللہ سے دے تو ملا

جب کہ ہمایوں سے چُھٹا ملک و تخت — اور پھنسا بندِ حوادث میں سخت
یار رہا اور نہ کوئی غمگسار — دوست و دشمن کے لگے چلنے وار
پھر گئے دلدادۂ فرماں تھے جو — چُھٹ گئے وابستۂ داماں تھے جو
گھر میں نہ رہنے کی ملی کوئی راہ — ملک میں لی غیر کے جا کر پناہ
ہو گئے اغیار یگانے سبھی — تو نے مگر ساتھ نہ چھوڑا کبھی
چھوٹ گئے سارے قریب و بعید — ایک نہ چھوٹی تو نہ چھوٹی اُمید
تیرے ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت — تیرے ہی صدقہ سے ملا تاج و تخت
خاکیوں کی تجھ سے ہی ہمّت بلند — تو نہ ہو تو کام ہوں دُنیا کے بند

تجھ سے ہی آباد ہیں کون و مکاں
تو نہ ہو تو ہو ابھی برہم جہاں

وعدے وفا کرتی ہی گو چند تو — رکھتی ہی ہر ایک کو خورسند تو
بھاتی ہے سب کو تری لیت و لعل — تو نے کہاں سیکھی ہے یہ آج کل
تلخ کو تو چاہے تو شیریں کرے — بزمِ عزا کو طرب آگیں کرے
آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس — رکھے غنی اُس کو رہے جس کے پاس
یاس کا پاتی ہے جو تو کچھ لگاؤ — سیکڑوں کرتی ہی اُتار اور چڑھاؤ

آنے نہیں دیتی دلوں پر ہراس ٹوٹنے دیتی نہیں طالب کی آس

جن کو میسّر نہیں کملی پھٹی خوش ہیں توقع پہ وہ زربفت کی

چلنی سے روٹی کا ہے جن کی بناؤ بیٹھے پکاتے ہیں وہ خیالی پلاؤ

پاؤں میں جوتی نہیں پر ہے یہ ذوق گھوڑا جو سبزہ ہو تو نیلا ہو طوق

فیض کے کھولے ہیں جہاں تو نے باب دیکھتے ہیں جھونپڑے محلوں کے خواب

تیرے کرشمے ہیں غضب دلفریب دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب

تجھ سے مہوّس نے جو شورے لیا پھونک دیا کان میں کیا جانے کیا

دل سے بھلایا زن و فرزند کو لگ گیا گھن نخلِ برومند کو

کھانے سے پینے سے ہوا سرد جی ایسی کچھ اکسیر کی لو لگ گئی

دین کی ہے فکر نہ دنیا سے کام دھن ہے یہی رات دن اور صبح شام

دھونکنی ہے بیٹھ کے جب دھونکتا شاہ کو سمجھتا ہے اک ادنیٰ گدا

پیسے کو جب تاؤ یہ دیتا ہے تاؤ پوچھتا یاروں سے سونے کا بھاؤ

کہتا ہے جب ہنستے ہیں سب دیکھ کر رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر

پھر اسی دھندے میں وہ آسودہ حال تو نے دیا عقل پہ پردہ سا ڈال

پھرتے ہیں محتاج کئی تیرہ بخت جن کے بڑوں میں تھا کبھی تاج و تخت

آج جو برتن ہی توکل گھر گرد   ملتی ہی مشکل سے انھیں نانِ جو
تیرے سوا خاک نہیں ان کے پاس   ساری خدائی میں ہی لے دے کی آس
پھُولے سماتے نہیں اس آس پر   صاحبِ عالم انھیں کہئیے اگر
کھاتے ہیں اس آس پہ قسمیں عجیب
جھوٹے کو ہو تخت نہ یارب نصیب

ہوتا ہی نومیدیوں کا جب ہجوم   آتی ہی حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمّت کی کمر ٹوٹنے   حوصلہ کا لگتا ہے جی چھوٹنے
ہوتی ہی بے صبری و طاقت میں جنگ   عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ
جی میں یہ آتا ہی کہ سم کھائیے   پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے
بیٹھنے لگتا ہی دل آوے کی طرح   یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح
ہوتا ہی شکوہ کبھی تقدیر کا   اُڑتا ہی خاکہ کبھی تدبیر کا
ٹھنتی ہی گردوں سے لڑائی کبھی   ہوتی ہی قسمت کی ہنسائی کبھی
جاتا ہی قابو سے دل آخر نکل   کرتی ہی ان مشکلوں کو تو ہی حل
کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں   رختِ سفر یاس نے باندھا وہیں

ساتھ گئی یاس کے پژمردگی ہو گئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحتِ جاں کا ہے بھید
چھوڑیو حاؔلی کا نہ ساتھ اے اُمید

حاؔلی

۲- گداز مایوسی

کوئی اُمّید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے ترے زلف کے سر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غالبؔ

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک جلد اوّل

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھکر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہو ہم سخن کوئی نہو اور ہم زباں کوئی نہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہو اور پاسباں کوئی نہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہو

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھکو ہونے نے نہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا نہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

غالبؔ

۳۔ راحتِ یاس

ٹکڑے جگر کیا تھا حسرت کے سم نے میرا
دم ناک میں کیا تھا طوفانِ غم نے میرا
خرمن جلا دیا تھا برقِ الم نے میرا
میں جان دے چکا تھا تو نے مجھے بچایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا سبز باغ برسوں اُمّید نے دکھائے
تھے وعدے اس کے جھوٹے سب میں نے آزمائے
دمبازیوں سے اُسکی دھوکے بہت سے کھائے
پھندے سے اسکے تو نے آخر مجھے چھڑایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

اُمّید کے وہ وعدے جھوٹی ہوائیاں تھیں
سب جَو فروشیاں تھیں گندم نمائیاں تھیں
دن رات کوششیں تھیں اور نارسائیاں تھیں
دھوکے کا تو نے پردہ آخر کو آ اُٹھایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا آرزو کی تپ تھی کیا شوق کا جنوں تھا
تن من جلا رہا تھا کیا شعلۂ دروں تھا
حرماں کے نشتروں سے دل تھا کہ غرقِ خوں تھا
زخموں پہ جاں کے تو نے مرہم سا آ لگایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا آہِ سرد تو نے ٹھنڈی ہوا چلائی — گہری سی نیند جس سے دردِ دروں کو آئی
کیا یاس تو نے میٹھی لوری سی آشنائی — کیا بھیرویں کی دُھن میں تو نے گنگنایا

اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا سُکھ کی زندگی ہے اب شوق ہے نہ حسرت — نے آرزو نہ حرماں نے توبہ ہے نہ لعنت
اے یاس تجھکو شاباش اے یاس تجھپہ رحمت — اُمید دُور ہو چل تو نے بہت ستایا

اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

گذر گئی خوب اپنی اب میں ہوں اور تو ہے — تجھکو ہی مجھ سے اُلفت یاں تیری جستجو ہے
میں جسم ہوں تو جاں ہے میں پھول ہوں تو بو ہے — یہ شکر ہے خدا نے مجھ سے تجھے ملایا

اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے ملایا

نیرنگ

۴۔ بزمِ عشرتِ دنیا

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سُنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدای چنگ — جنّتِ نگاہ یہ تو وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غالب

۵۔ عشرتِ فانی

یادِ ایّام عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت سے سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشکِ آسماں سے ملی — ہائے کیسی بلند ایوانی
ایسی وحشت سرا میں آئے کیوں — بے دری کر رہی ہے دربانی
کیا ہوئی وہ بلندیِ دیوار — کیا ہوئے وہ عمادِ طولانی
سقفِ رنگین و زرنگار کہاں — جز سپہر و نجومِ نورانی
صرف دلقِ گدا ہوئے پردے — زینت افزائے کاخِ سلطانی

یا ظروف وسماط سے تھا بجھے دعوئے قیصری و خاقانی
یا نہیں ہی مرقع وکشکول تا کردں تازہ رسمِ ساسانی
یا یہاں پرنیان و اطلس سے جلوہ گر تھی سپہر سامانی
یا یہ احوال ہی کہ چاک ہوا تنگیوں سے لباسِ عریانی
مسندِ گوہری کا دھیان آیا پوچھتے کیا ہو وجہ گریانی
شورِ زاغ و زغن ہی شمع خراش اب کہاں بلبل و غزل خوانی

ایک دن یوں ہجومِ یاراں تھا
جیسے اب مجمع پریشانی

مومن

۶- رواروی

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہ رواں کوئی تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہردن تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

انشا

۷۔ مُسافرتِ دُنیا

یہ آج صاحبِ طبل و علم ہے کل وہ ہے — ہے اپنے نام کی نوبت ہر اک بجاجاتا
محیطِ دہر میں استادہ صورتِ کشتی — دکھائی دیتا ہوں سب کو یہ ہوں چلا جاتا

خبر نہیں کہ کہاں جاؤں گا چلا ہوں کہاں
مثالِ ریگ پریں ہوں پر اُڑا جاتا

کوئی یہ بڑھ کے مرے ساتھ والوں سے کہہ دے
یہ ناتواں ہی پسِ قافلہ رہا جاتا

اکیلے منزلِ ہستی میں کیا کروگے ترنّم
چلو عدم کو ہی یاروں کا قافلہ جاتا

(ترنّم)

۸۔ سرائے دُنیا

سرائے دنیا ہی خوف کی جا
ہر ایک کو کوچ دم بدم ہی

رہا سکندر یہاں نہ دارا
نہ ہی فریدوں نہ اور جم ہی

مسافرانہ ٹکے ہو، اُٹھو کہ
مقام فردوس ہی ارم ہی

سفر ہی دشوار خواب کب تک
بہت بڑی منزلِ عدم ہی

نسیم جاگو کمر کو باندھو
اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہی

سرورِ عیش و نشاط و عشرت
یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے

ملال و رنج و غم و مُصیبت
یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے

غرور و تمکین و کبر و نخوت
یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے

نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

قیام عُمرِ دو روزہ جانی کبھی نہیں ایک قاعدے پر
تعلّقِ عیشِ زندگانی کبھی نہیں ایک قاعدے پر
جو چار دن ہے دفورِ راحت تو بعد اِس کے غم و الم ہے
نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

نسیم

۹ منزلِ دُنیا

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جسمیں
وہ گل ہے یہ گل بوئے محبّت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوست مروّت نہیں جس میں
وہ شہد ہے یہ شہد حلاوت نہیں جس میں
بے درد الم شامِ غریباں نہیں گزری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری

گودی میں کبھی ماں کے کبھی قبر کا آغوش
گل پیرہن اکثر نظر آتے ہیں کفن پوش
سرگرمِ سخن ہے کبھی انساں کبھی خاموش
گہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بسرِ دوش

اِک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مسن کو
شب کو جو چھپر کھٹ میں تو تابوت میں دن کو

کرتا نہیں غربت میں کوئی آکے مدد تک — گر ساتھ گیا ہی تو کوئی قبر کی حد تک
پھر آتے ہیں روتے ہوئے پہنچا کی لحد تک — وہ خانۂ تاریک میں تنہائی ابد تک

نہ دوست نہ احباب نہ ہم بزم گئے ہیں
تنہا یونہی شاہانِ اولوالعزم گئے ہیں

انیس

۱۰۔ آنی جانی

عدم سے بشر آئے گا ایک دن — زمانہ کہے گا اُسے نیک دن
لڑکپن کے دن ہونگے شاہی کے دن — محبّت کے دن بے گناہی کے دن

خوشی اِن دنوں نور برسائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گذر جائے گی

پھر آئے گا مدہوش کرنے شباب — رہے گا خیالِ شراب و کباب
کبھی جوشِ مستی کبھی نوشِ خواب — نہ فکرِ ثواب و نہ خوفِ عذاب

گھٹا دل پہ پندار کی چھائیگی
مگر یہ گھڑی بھی گذر جائیگی

سپاہی جو اس مرد کہلائیگا لڑائی میں زخمِ گراں کھائیگا
غش آئے گا سیروں لہو جائیگا کراہے گا تڑپے گا چلّائیگا
قضا بوند پانی کو ترسائیگی
مگر یہ گھڑی بھی گذر جائیگی

بشر ہوگا عالم میں ذی احتشام بڑھے گی لیاقت سے شہرت تمام
رہے گو نہ شہرت بھی اس کی مدام کہ شہرت کو بھی یاں نہیں ہے قیام
یہ شہرت نیا رنگ چمکائیگی
مگر یہ گھڑی بھی گذر جائیگی

زمانہ کرے گا جواں کو ادھیڑ توانائی کا ہوگا پژمردہ پیڑ
لگائے گا اسپ جوانی کو ایڑ نقاہت کرے گی قواؤں سے چھیڑ
طبیعت اس آفت سے گھبرائیگی
مگر یہ گھڑی بھی گذر جائیگی

بڑھاپے سے ہوگا بڑا انقلاب نہ ہوگی دلیری نہ ہوگا شباب

ضعیفی کرے گی کل اعضا خراب — یہاں تک کہ جینا بھی ہوگا عذاب — جلد اوّل

اجل چیل سی سر پہ منڈلائیگی
مگر یہ گھڑی بھی گذر جائیگی

مرض موت کا جب اُٹھائیگا سر — دوا کرکے ہارینگے کُل چارہ گر
بگڑ جائے گا کھیل سب سربسر — بن آئے گی بیمار کی جان پر

بڑی سختیاں نزع دکھلائیگی
مگر یہ گھڑی بھی گذر جائیگی

طالب بنارسی

۱۱۔ جب لاد چلیگا بنجارا

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقّارہ
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں اور پلّا بھارا
کیا گیہوں چاول موٹ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
کیا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستہ میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا۔ اِک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
جب چلتے چلتے رستہ میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی
اِک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصّوں میں بٹ جاوے گی
دِھی پوت جوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
کیوں جی پر بوجھ اُٹھاتا ہے اِن گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سُنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

۱۲- سرائے فانی

جائے عبرت سرائے فانی ہے — مَوردِ مرگِ ناگہانی ہے

اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گُل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بُلبُلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانہ بوم

بات کل کی ہے نوجوان تھے جو — صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرتِ حورِ مہ جبیں نہ رہے — ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم — ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم

کوئی لیتا بھی اب نہیں یہ نام — کون سی گور میں گیا بہرام

اب نہ رُستم نہ سام باقی ہے — اِک فقط نام ہی نام باقی ہے

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج — آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

تھے جو خود سر جہان میں مشہور — خاک میں مِل گیا سب اُن کا غرور

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

اوّل گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور — باقی اِن کا نہیں نشانِ قبور
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشک یوسف جو تھے جہاں میں حسیں — کھا گئے اُن کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ — نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ
بوئے اُلفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ
موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے

مرزا شوق

۱۳ — بے ثباتیِ دنیا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھکے چل راہِ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

میر

عجب سیر دیکھی نظیر اس چمن کی — ابھی دخل تھا نرگس و نسترن کا — جلد اوّل
ابھی یک دگر جمع تھے سنبل و گل — ابھی تھا ہم جوش سرو سمن کا
گھڑی بھر کے پھر بعد دیکھا یہ عالم
کہ نام و نشاں بھی نہ تھا اس چمن کا

نظیر اکبرآبادی

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ — دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

سودا

خسرو کے سر پہ وہ نہ رہا تاجِ خسروی
نے رہ گیا وہ چترِ فلک سا ہی جم کے ساتھ
کیسی اب ان کی دھوپ میں جلتی ہیں تربتیں
سائے میں یاں پلے تھے جو ناز و نعم کے ساتھ

مصحفی

ویراں ہے کوئی گھر کہیں آبادی ہے — راحت سے کوئی اور کوئی فریادی ہے
اک عشرت و غم کا ہے مرقع دنیا — ماتم ہے کسی جا تو کہیں شادی ہے

انیس

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

آتش

مسرت ہوئی ہنس لیے دو گھڑی مصیبت پڑی رو کے چپ ہو رہے

اسی طور سے کٹ گیا روزِ زیست سلایا شبِ گور نے سو رہے

اکبر

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو ہو معلوم وقتِ مرگ ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق

اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

ذوق

اپنی ہستی حباب کی سی ہے یہ نمایش سراب کی سی ہے

چشم دل کھول اِس ہی عالم پر یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

میر

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک جلد اوّل
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالبؔ

سرِ راہِ عدم گورِ غریباں طرفہ بستی ہے
کبھی غربت برستی ہے کبھی حسرت برستی ہے
نہ گھبرا اے دلِ واماندہ اب منزل قریب آئی
اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے
کبھی کروٹ نہیں لیتا کوئی گورِ غریباں میں
یہ کیسی نیند سوتے ہیں یہ کیسی ان کی بستی ہے

امیرؔ

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہائے رنگا رنگ ہم
مثلِ نرگس کے ہیں جب تک اپنی دونو چشم وا
آخرش ہوگا وہی اک دن خزاں کے ہاتھ سے
جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا

ہے غنیمت کوئی دن نظارۂ باغ و بہار
پھر کہاں یہ گلشن اور گل اور یہ سبزہ یہ ہوا

ذوقؔ

ہر صبح کو یہ شور ہے مرغِ سحری کا | چونکو کہ زمانہ نہ رہا بے خبری کا
دتفہ نہیں اب بزم سے ہوتا ہے یہ رخصت | منھ دیکھ رہا ہوں میں چراغِ سحری کا
دنیا ہے خبر ہے جنبہ احباب کا اُٹھنا | پر ان نہیں اُٹھتا ہے مگر بے خبری کا

کچھ روز دل ابھی صبر کر اے پنجۂ وحشت
بے موسمِ گل لطف نہیں جامہ دری کا

امیرؔ

عمر برق و شرار ہے دنیا | کتنی بے اعتبار ہے دنیا
داغ سے کوئی دل نہیں خالی | کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا
ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع | عرصۂ کارزار ہے دنیا
اہلِ رغبت سے کرتی ہے نفرت | بڑی پرہیزگار ہے دنیا
آنے جانے پہ سانس کی ہے مدار | سخت ناپائدار ہے دنیا
ایک جھونکے میں ہے ادھر سے اُدھر | چار دن کی بہار ہے دنیا

بدتر اُس کو سمجھ خزاں سے امیرؔ
دیکھنے کو بہار ہے دنیا

آمیرؔ

۱۴۔ جوگی

کل صُبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیِ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے عرفان کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دلکش وہ سماعِ طیور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزم سرور سجائی تھی
بن میں گلشن میں آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا

تھا دلکش منظر دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اِس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرؔ دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پہ چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی

یہاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی

یاں قُلّۂ کوہ پہ رہتا تھا اِک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کے اور انگ بھبوت رمائی تھی

تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیبِ کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی

سب خلقِ خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی

جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اُٹھا کر ناظرؔ سے یوں بن باسی نے کلام کیا

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لیئے آکے ستاتے ہو

میں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آکے پھنساتے ہو

کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا

کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو سنانے آتے ہو

ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اِس نگری سے مُنہ موڑ چکے

ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لاکے وہی پہناتے ہو

تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی

ہم جوت لگاتے ہیں من کی تم اس کو آکے بجھاتے ہو ۵

اِس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا

کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق جوش میں آ جوگی

ہم آئے تھے تیرے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی

آبادی سے مُنہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں

ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی

کیا مندر میں کیا مسجد میں سب جلوہ ہی وجہ اللہ کا
پربت میں نگری میں ساگر میں ہر اُترا ہی ہرجا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے، واں حسن پہ عشق مچلتا ہی
واں پریم کا ساغر چلتا ہی چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہی ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی
اِن چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے مت اِس پہ تیل گرا بابا
ہی شہروں میں غُل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھو کی ہی بن میں جا بابا
ہی شہروں میں شورش نفسانی جنگل میں ہی جلوہ روحانی
ہی نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سی پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا

سر پر آکاس کا منڈل ہے دھرتی یہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا

جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا

ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمھیں اور یاد نہیں بھگوان تمھیں
سل، پتھر، اینٹ، مکان تمھیں دیتے ہیں سکھ سے چھڑا بابا

تن من کو دھن میں لگاتے ہو ہیم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالم فانی ہے باقی ہے ذاتِ خدا بابا

ناظمؔ

ڈل

۱۵- جامِ شہادت

تڑپتا ہی تنہا وہ فرشِ زمیں پر نہ غمخوار کوئی نہ تکیہ نہ بستر
اِدھر اِس کی بندوق ٹوٹی پڑی ہے گرا خاک پر ہی اُدھر اُس کا خنجر
نہ آتی ہی کانوں میں آواز ہمدم کہ پانی پلائے اسے ترس کھا کر
نہ توپوں کا شور اور نہ گولوں کی بارش نہ گھوڑا نہ جھنڈا سپاہی نہ افسر
تعاقب میں دشمن کے سب چلدئیے ہیں عقب میں اسے چھوڑ حیران و مضطر
وہ حسرت سے چاروں طرف دیکھتا ہی کبھی لیٹے لیٹے کبھی سر اُٹھا کر
تباہی کے آثار ہر سو عیاں ہیں بنی ہی زمیں خوں سے دریائے احمر
نہ گھر کی خبر ہی نہ غمخوار کوئی نہ باپ اور نہ بیٹا برادر نہ مادر
سرہانے کھڑی یہ اجل کہہ رہی ہی کہ اِس زخم کاری سے ہوگا نہ جانبر

اِسی کشمکش میں وہ دم توڑتا ہے
گلستانِ ہستی سے مُنہ موڑتا ہے

مئے قوم ملّت کے سرشار آؤ بہادر سپاہی کا لاشہ اُٹھاؤ
وطن کی محبت میں مارا گیا ہے اِسے اِس کی خاکِ وطن میں سُلاؤ

بدن اِس کا زخموں سے ہی چور سارا ذرا قبر میں ہلکے ہلکے لٹاؤ
کھلا کچھ نہ غنچہ اُمیدوں کا اس کی تم اب اِس کی تربت پہ کلیاں چڑھاؤ
سپاہی کی عزت اگر چاہتے ہو تو اللہ اکبر کے نعرے لگاؤ
کسی کے بھرے گھر کا یہ نور ہوگا سرِ شام مرقد پہ شمعیں جلاؤ
کبھی غیر قوموں میں گر جا کے بیٹھو تو اِس کی دلیری کے قصّے سناؤ
مصائب کا اس کی اگر دھیان آئے تو آنکھوں سے آنسو کے قطرے گراؤ

وہ مذہب پہ اپنے فدا ہو گیا ہے
وہ فانی سے اہلِ بقا ہو گیا ہے

نجم گیلانی

۱۶۔ میدانِ جنگ

جہاں کل سپہدار تھے حکمراں کھڑے تھے جہاں ترچھے بانکے جواں
جہاں کل تھے فیلانِ جنگی ہزار کوداتے تھے گھوڑے جہاں شہسوار
جہاں پاسباں کل تھے للکارتے پرندے بھی ڈرتے تھے پر مارتے

جلد اوّل وہاں آج لاشوں کے انبار ہیں پڑے ہر طرف سینہ افگار ہیں
وہ سر جس پہ تھا کل جواہر کا تاج
سو ہے خاک اور خوں میں آلودہ آج

اسمٰعیل

۱۷۔ عبرت

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
خوب ملکِ روس ہے اور سرزمینِ طوس
گر میسّر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی
اس طرف آوازِ طبل ادھر صدائے کوس ہے
سُنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قیدِ آز میں محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف
جس جگہ جانِ تمنّا سو طرح مایوس ہے

مرقد میں دو تین تبلا کے لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہی یہ دارا ہی یہ کیکاؤس ہی
پوچھ لوں اِن سے کہ جاہ و حشمتِ دنیا سی آج
کچھ بھی اِن کے پاس جز از حسرت و افسوس ہے

نظیر اکبر آبادی

۱۸- عبرت

دیکھیں پروانے کو دعووں پہ اُبھرنے والے
عشق اسے کہتے ہیں یوں مرتے ہیں مرنے والے
نہ رہا یاد اِنھیں کیسا اثرِ فصلِ خزاں
کیوں جوانانِ چمن پھر ہیں سنورنے والے
تیز رفتار نہ ہو اِس قدر اے موجِ صبا
تجھ میں کچھ قطرے ہوا سے ہیں اُبھرنے والے

اکبر الہ آبادی

جذباتِ دل

۱۹- موت کی گھڑی

موسمِ خاص میں ہوتے ہیں شجر برگ فشاں
پھول مُرجھاتے ہیں جب باغ میں آتی ہی خزاں
صُبح ہوتی ہے تو ہوتے ہیں ستارے پنہاں
لیکن اے موت مقرر ہے ترا وقت کہاں

دن کو ہوتا ہی غمِ دہر سے ہر ایک کو کام
دوست مِل جائیں ہم آتی ہی اس واسطے شام
رات ہوتی ہی کہ ہو سب کو مُیَسّر آرام
لیکن اے موت ترے آنے کے ہیں وقت تمام

ہم کو معلوم ہی کب بدر کو ہوتا ہے ہلال
اُڑ کے کب جائیں گے مرغانِ ہوا سوئے شمال
کب خزاں آکے گلستاں کو کرے گی پامال
کون بتلائے کہ کب کیجے ترا استقبال

کیا وہ موسم ہی ترا جب کہ بہار آتی ہے
اور صبا حُسنِ گُلِ تر کو نکھار آتی ہے

یا خزاں باغ میں جب لے کے غبار آتی ہی
نہیں ہر وقت تو کرنے کو شکار آتی ہی

تو وہاں بھی ہی جہاں ملتے ہیں دو سینہ فگار
دُکھڑے رونے کیلئے بیٹھ کے زیرِ اشجار

تو وہاں بھی ہی جہاں ملتی ہیں فوجیں خونخوار
اور دکھاتی ہی جہاں رزم میں جوہر تلوار

بحر و بر سب کو ہے منظور اطاعت تیری
کر رہی کام ہوا میں بھی ہی طاقت تیری

دل سے راحت میں بھی جاتی نہیں ہیبت تیری
ہم جہاں جائیں نظر آتی ہی صورت تیری

شاکر میرٹھی

جلد اوّل

۲۰۔ موت کا نقارہ

دو چار گھڑی یا دو دن میں اب تن سے جان نکلنی ہے

یہ ہڈی پسلی جتنی ہے یا گلنی ہے یا جلنی ہے

ہر رات جو باقی تھوڑی سی کوئی دم میں یہ بھی ڈھلنی ہے

اُٹھو باندھو کمر سویرے سے تم کو بھی منزل چلنی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پہ زین دھرو بابا

اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

کچھ دیر نہیں اب چلنے میں کیا آج چلو یا کل نکلو

کچھ کپڑا اللہ لینا ہو سو جلدی باندھ سنبھل نکلو

اب شام نہیں اب صبح ہوئی جوں موم پگھل کر ڈھل نکلو

کیوں ناحق دھوپ چڑھاتے ہو بس ٹھنڈے ٹھنڈے چل نکلو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پہ زین دھرو بابا

اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ اونٹ کرائے کا یارو صندوق جنازہ ارتھی ہے
جب اس پہ ہوا اسوار چلے پھر گھوڑا ہے نہ عماری ہے
کس نیند پڑے تم سوتے ہو یہ بوجھ تمھارا بھاری ہے
کچھ دیر نہیں اب آہ نظیرؔ تیار کھڑی اسواری ہے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پہ زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

نظیر اکبرآبادی

۲۱۔ موت

نزع کا وقت بُرا وقت ہے خالق کی پناہ ہے وہ ساعت کہ قیامت سے سوا ہوتی ہے
روح تو ایک طرف ہوتی ہے رخصت تن سے آرزو ایک طرف دل سے جُدا ہوتی ہے
جسم تو خاک میں ملجاتے ہوئے دیکھتے ہیں
روح کیا جانے کدھر جاتی ہے کیا ہوتی ہے

اکبر

۲۲۔ موت

اے موت بحر و بر پہ ہی سکّہ رواں ترا — ظالم مطیعِ حکم ہے سارا جہاں ترا

راہِ جفا پہ کوئی نہیں ہم عناں ترا — توسن رواں ہی صورتِ برقِ تپاں ترا

کچھ کچھ شریک جور ہی گو آسماں ترا — لیکن وہ دوں خصال بھی ثانی کہاں ترا

تو پھول توڑ لیتی ہی اس کے چمن سے بھی

ہر صبح ہی رُخِ مہ و انجم پہ مردنی

ماتم کدہ یہ دہر جو ہی تیرے دم سے ہی — ویراں ہر ایک شہر جو ہی تیرے دم سے ہی

دریائے غم میں لہر جو ہی تیرے دم سے ہی — نالوں میں لہر بہر جو ہی تیرے دم سے ہی

اِمرت جہاں میں زہر جو ہی تیرے دم سے ہی — جینا خدا کا قہر جو ہی تیرے دم سے ہی

جو دل ہی تیرے داغ سے یاں لالہ زار ہی

ماہی سے ماہ تک جو ہی سودا غدار ہی

مارا کسی غریب کو تو نے وطن سے دُور — ماں باپ سے بہت پرے بھائی بہن سے دُور

لاشہ کوئی پڑا ہی مزار و کفن سے دُور — دستِ صدائے شیون و شورِ محن سے دُور

پھولوں کی آہ ناز بھری انجمن سے دور — گھونٹا گلا ہزار کا صحنِ چمن سے دور

گھیرا کسی کو ورطۂ دریا کے درمیاں

پھانسا کسی کو دامنِ صحرا کے درمیاں

تو جس کا بچہ لے گئی اُس ماں کا حال دیکھ — جاری ہیں اشک گرچہ ہوئے ماہ و سال دیکھ

اے موت دیکھ طولِ زمانِ ملال دیکھ — اب تک اَٹے ہیں گرد سے سب کے بال دیکھ

ایسی بھی غمزدوں کی کہیں ہے مثال دیکھ — ہر وقت رونے دھونے سے ہیں آنکھ لال دیکھ

نورِ نظر کے غم میں یہ اتنا جو روئے گی

آنکھیں تو خیر جان کو اِک روز کھوئے گی

اے موت آہ تیرے ستائے ہوئے یتیم — نقشِ غلط کی طرح مٹائے ہوئے یتیم

وہ سیلِ اشکِ خوں میں بہائے ہوئے یتیم — سوزِ غمِ نہاں کے جلائے ہوئے یتیم

دوشِ پدر سے خاک پہ آئے ہوئے یتیم — گودی سے ماں کی آہ چھڑائے ہوئے یتیم

روتے ہیں اور دیتے ہیں بد دعا تجھے

اِن کو رُلا کے موت بھلا کیا ملا تجھے

عاشق کو آکے حسن کا جلوہ دکھا گئی — دِل آگیا کسی پہ تو بس موت آگئی

پروانے سے کے شکار کو شمعیں جلا گئی　　گل ہر عندلیب چمن میں کھلا گئی
جھونکوں میں جب سموم کے ظالم سما گئی　　دم میں چراغ ہستیِ گل کو بجھا گئی

صیّاد بن کے مرغِ چمن زاد پر گری
او ر برق ہو کے خانہ صیّاد پر گری

اے موت مت ڈرا مجھے مجھکو فنا نہیں　　جلنے کا مجھ پہ نام کو جادو ترا نہیں
کچھ ابتدا نہیں ہی مری انتہا نہیں　　میں وہ ہوں مجھ سے چھیڑ کی لینا بجا نہیں
تیری رسائی جسم سے آگے ذرا نہیں　　ہاں جسم تیرا مال ہی بیشک مرا نہیں

شمشان تیری آگ مجھے کب جلا سکی
آغوشِ قبر تو مجھے کیونکر دبا سکے

محروم

۲۳- مرگِ پسر

جیتا نہیں وہ جس کے مقدر میں ہی مرنا　　مشکل ہی مگر صبر کی سل چھاتی پہ دھرنا
آفت تو ہی فرزند کا دُنیا سے گذرنا　　انسان کو لازم ہے مگر صبر ہی کرنا

برسوں سے یہی رنگِ گلستانِ جہاں ہے
جس گل پہ بہار آج ہے کل اُس پہ خزاں ہے

کچھ پھول تو دکھلا کے بہار اپنی ہیں جاتے — کچھ سوکھ کے کانٹوں کی طرح ہیں نظر آتے
کچھ گل ہیں کہ پھولے نہیں جامہ میں سماتے — غنچے بہت ایسے ہیں کہ کھلنے نہیں پاتے

بلبل کی طرح روتے ہیں فریاد و فغاں سے
کچھ بس نہیں چلتا چمن آرائے جہاں سے

مرتا ہے جواں سامنے اور دیکھتے ہیں پیر — ماں باپ کا کیا زور یہی خواہشِ تقدیر
سر پیٹ کے فریاد کرے مادرِ دلگیر — جز صبر نہ آتی نہیں لیکن کوئی تدبیر

آرام جسے دیتے ہیں چھاتی پہ سُلا کر
رکھ آتے ہیں ہاتھوں سے اسے قبر میں جا کر

مٹی سے بچاتے ہیں سدا جن کا تنِ پاک — اُس گل پہ گرا دیتے ہیں اب سینکڑوں من خاک
مادر جسے عریاں نہیں کرتی تہِ افلاک — وہ قبر میں سوتا ہے دھری رہتی ہے پوشاک

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا

۲۴- مرثیۂ فرزند

رکھا ترے دامن میں ہی کیسے گُلِ تر کو
رکھ آنکھ میں اے قبر مرے نورِ نظر کو

ہی آگ لگی آگ لگے اِس کی اثر کو
جاتا ہی کہاں نالۂ دل پھونک کے گھر کو

پہلو میں ہمارے غضب اک پھانس چُبھی ہے
رہ رہ کے بڑھاتی ہی وہی دردِ جگر کو

یکساں ہی مرے گھر میں شب و روز کا عالم
پھرتے ہیں منہ پھیر لیے شام و سحر کو

جب خاک سے بچتے نہیں پُر درد دامن
کیا لے کے کریں لالۂ و گل لال و گہر کو

شب گورِ غریباں میں بسر کرتی ہی امی وہ
ہم شام کو جا رہتے ہیں آتی ہیں سحر کو

مقبول دعائیں نہیں ہوتیں نہیں ہوتیں
قسمت میں ترسنا ہی ترستے ہیں اثر کو

گریاں ہیں ریاض آپ غمِ مرگ میں کس کے
درپیش ہی رہ اہی ہر فرد بشر کو

ریاض

۲۵- مرثیۂ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیںگے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہرحال یہ مدّت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دن اور

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

غالب

۲۶- نوحہ وفات نادر شاعر

مرگِ نادرؔ کی خبر کاش نہ آئی ہوتی
باعثِ گریہ نہ پوچھو نہ سنائی ہوتی

اے فلک اور بھی نادر کو تو جینے دیتا
کون سی اس میں بھلا تیری برائی ہوتی

اِک چہکتی ہوئی بلبل کا گلا کیوں گھونٹا
ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

کیسا اندھیر ہوا باد فنا کے جھونکو
آہ یہ شمع تو تم نے نہ بجھائی ہوتی

ندرت آمیز یہ تصویرِ تخیّل افسوس
دستِ بیداد اجل نے نہ مٹائی ہوتی

ہند میں آج تھا تو موجدِ نو طرزِ سخن
کوئی دن اور تری تازہ نوائی ہوتی

تیرے جذباتِ مصفّا تھے جواہر نادر
کوئی دن اور بھی دولت یہ لٹائی ہوتی

ابھی تازہ تھا غم رحلتِ آزادؔ و سرورؔ
ترے سر میں تو سفر کی نہ سمائی ہوتی

گلشنِ ہند کی رونق تھا ترانہ تیرا
کون سے کنج میں اب ہوگا ٹھکانا تیرا

ساغرِ نو میں مئے کہنۂ سرمد کی جھلک
برقی شعلوں میں وہی سوزِ پرانا تیرا

دیر تک تجھ کو نہ بھولینگے زمانے والے
گو بسر ہو گیا یوں جلد زمانہ تیرا

روئینگے خم کدۂ شعر میں آنے والے چھیڑیگا پیرِ مغاں جب کہ فسانہ تیرا

بوئے گل بھاند کے دیوارِ گلستاں نکلی

بس یہی گلشنِ امکاں سے ہی جانا تیرا

محروم

۲۷۔ کسی لڑکے کا مدرسہ میں انتظار

(دیر بھان ایک نہایت ہونہار لڑکا دس بارہ سال کی عمر چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ چیچک نکلی اور عین امتحان کے دن ملکِ بقا کو روانہ ہوا)

آ جلد مدرسہ پہنچ اے دیر بھان آج تجھ کو خبر نہیں ہی کہ ہے امتحان آج

ہیں آئے بیٹھے کب سے ترے ہم سبق یہاں آنا ہی تھا سویرے کہ ہے روزِ امتحان

اتنی تو دیر کرنے کی عادت نہ تھی تجھے کچھ غیر حاضری سے محبت نہ تھی تجھے

تو سب سے پہلے، روز پہنچتا تھا مدرسے کیوں گھر پہ آج رہ گیا کیا ہو گیا تجھے

کھولی نہیں ہی کیا ابھی خوابِ سحر نے آنکھ سورج دکھا رہا ہی مری جان ادھر سے آنکھ

اُٹھ آنے والی رات پہ غفلت کو ٹال تو

اب مدرسے کا وقت ہی جز داں سنبھال تو

جلد اوّل

اے ویرِ بھان آج تو بے طور نیند ہے   تجھ کو عبث جگاتے ہیں یہ اور نیند ہے

افسوس تو تو اور ہی خوابِ گراں میں ہے   ہے روح اُس جہان میں جسم اِس جہاں میں ہے

چیچک نے آہ تجھ کو پیامِ قضا دیا   ہم کس طرح جگائیں اجل نے سُلا دیا

گھڑیال کی صدا بھی نہ تجھ کو جا سکی

بانگِ طیورِ صبح نہ کچھ کام آ سکی

کیسی گھڑی میں آہ تجھے آئی سیتلا   اے کاش کرتی رحم بھی کچھ مائی سیتلا

یوں ناشگفتہ غنچے کو کوئی توڑتا نہیں   گلچینِ مرگ آہ مگر چھوڑتا نہیں

ہے ہے عذاب موت کا ننھی سی جان پر   دیکھے سے جس کے پھٹتا ہے ماں باپ کا جگر

اُمید بھی ہے یاس کی زخم نہاں بھی ہیں   مصروف چارہ سازی بھی ہیں نوحہ خواں بھی ہیں

تقدیر اُلٹ گئی کہ دوا میں اثر نہیں   افسوس اب علاج کوئی کارگر نہیں

بیٹھی ہے موت تاک میں بچّے پہ وار ہے   اب کیا رہا کہ تیر کلیجے کے پار ہے

اب تک بھی ہے یہ وہم کہ روٹھا ہوا نہ ہو

شانہ ہلا رہے ہیں کہ سویا ہوا نہ ہو

پر بولنا محال ہے اب ویرِ بھان کا   واقف نہیں رہا وہ ہمارے جہان کا

پڑھکر یہاں خموشیِ جاوید کا سبق | ہے دیکھتا کتابِ بقا کا ورق ورق
ننھے سے دل میں آہ وہ طوفانِ ذوقِ علم | پہلو میں لے گیا ہے تو ارمانِ ذوقِ علم
وہ دلفزا اُمیدیں وہ بچپن کے ولولے | تیرے یہ غمگسار ترے ساتھ اُٹھ چلے
اے آہ بچپنے کی وہ معصوم حسرتیں | معدوم ہوگئیں تری موہوم حسرتیں

طے ہوگئیں وہ تیری خیالی ترقیاں
وہ عمر کے مدارجِ عالی ترقیاں

وہ بھولی بھالی شکل ہے آنکھوں کے روبرو | کمرے میں پھر رہی ہے وہ تصویر ہو بہو
اُبھرا ہوا وہ ماتھا وہ آنکھیں غزال سی | اور ان پہ ابروؤں کی سجاوٹ ہلال سی
آیا ہوا لبوں پہ تبسم ذرا ذرا | وہ توتلی زباں کا تکلم ذرا ذرا
بچپن کی شوخیاں وہ ادب سے رُکی ہوئیں | ہر وقت وہ کتاب پہ آنکھیں جھکی ہوئیں
ہائے وہ تیری ظاہر و باطن کی خوبیاں | بھجتے نہیں وہ ہوتی ہیں یہ جنکی خوبیاں

ہونا ہی تھا جدا کہ ہمیں تجھ سے پیار تھا
مرنا ہی تھا تجھے کہ بہت ہونہار تھا

محروم

۲۸۔ کلیجے کا داغ

زینہ نہ بامِ عرش کا اتنا بلند تھا — میری دعا کو بابِ اجابت ہی بند تھا
تیرِ اجل کو آہ نہ درماں پسند تھا — اچھا ہوا کسی سے نہ، وہ دردمند تھا

دھڑکن گئی نہ دل کی نہ دردِ جگر گیا
بالیں سے نا اُمید تری چارہ گر گیا

وہ آہ تیری چاند سی صورت کدھر گئی — آنکھوں کا نور رُخ کی صباحت کدھر گئی
ہونٹوں کی لال لال وہ رنگت کدھر گئی — بچپن کی مسکرانے کی عادت کدھر گئی

ہونٹوں پہ اب ہنسی ہے نہ جنبش زبان کو
کیا جانے کیا ہوا مری ننھی سی جان کو

چہرے سے آہ یوں ہی صباحت اُڑی ہوئی — جیسے خزاں میں پھول سے نکہت اُڑی ہوئی
دل سرد جسم سے ہی حرارت اُڑی ہوئی — رُخ سے گلاب کی سی ہی رنگت اُڑی ہوئی

آنکھیں کنول سی ہیں نہ وہ چہرہ ہے پھول سا
لوگو، ہے آج کچھ مرا ننھا ملول سا

نہاں اجل کا دستِ ستم آستیں میں ہی مجھکو خبر نہ تھی کہ یہ ظالم کمیں میں ہی
آنکھوں میں نور ہی نہ صباحت جبیں میں ہے قالب یہاں ہی روح بہشتِ بریں میں ہی

زانو پہ سو گیا مرے سر رکھ کے آہ تو
کھولیگا آنکھ کب مرے نورِ نگاہ تو

گو مجھ سے اب نگاہ نہیں آشنا تری مجھکو مگر ہی آہ وہی مامتا تری
اگلی سی وہ اگرچہ نہیں ہی ادا تری اس غم میں بھی شبیہ ہی تسکیں فزا تری

تو کوئی دم میں خاک کا پیوند ہی سہی
بوسے تو لے رہی ہوں میں لب بند ہی سہی

صبر و سکوں کا کر نہ سفینہ تباہ تو ماں کا سمجھ کے توڑ دلِ دادخواہ تو
بے نور آنکھ ہی مری نورِ نگاہ تو یعنی ہی مجھ غریب کا روزِ سیاہ تو

میں نے سمجھ کے خاک کا پتلا زمین کو
حافظ خدا ترا، تجھے سونپا زمین کو

ایذا سے جانِ زار جو کاہش طلب رہی دن بھر پسر کی یاد میں میں مضطرب رہی
جب نصف شب گزر گئی اور نصف شب رہی دل میں نہ آہ، طاقتِ رنج و تعب رہی

(۳)

نیند آگئی تو طرفہ تماشا نظر پڑا
اک کنج پُر فضا لبِ دریا نظر پڑا

پچھلے پہر کا وقت تھا جاں بخش تھی ہوا
اور میرے ساتھ تھا مرا ننھا ٹہل رہا
صورت تھی پیاری پیاری وہ معصوم دلربا
اک پھول تھا گلاب کا گویا کھلا ہوا

پُھولوں کی بو سے بادِ صبا عطر بیز تھی
سر پر شعاع نور کی اک جلوہ ریز تھی

چہرے پہ نور کی جو کرن تھی چمک رہی
تھی گورے گورے گالوں پہ سُرخی جھلک رہی
وقتِ خرام نازکمر تھی لچک رہی
شبنم ادھر گلاب تھی رُخ پر چھڑک رہی

رُخ پر جو چاندنی نے اُجالا تھا کر دیا
مکھڑے کا اور حسن دوبالا تھا کر دیا

کہتا تھا مسکرا کے مجھے یوں دکھا کے پھول
کس رنگ کے یہ گل ہیں ہیں کس ادا کے پھول
کلیاں گلاب کی ہیں نہ یہ موتیا کے پھول
دلکش عجب ہیں اس چمنِ دلکشا کے پھول

دنیا کی ہی ہوا انھیں چھو بھی نہیں گئی
اُڑ کر ہی ان کی خلد سے بو بھی نہیں گئی

اِس کنج دلنشیں کی ہی آب و ہوا پسند
دنیا کی اب نہیں مجھے اماں! وا پسند جلد اوّل

ہو جس کو خلد کا چمنِ دلکشا پسند
کانٹوں کو دہر کے وہ کرے آہ کیا پسند

دنیا سے آہ اب مجھے دل بستگی نہیں
میں شاد ہوں کہ مجھ کو غمِ خستگی نہیں

میں جانتا ہوں ضبط کی عادت ہی کم تمھیں
برسوں رلائیگا مرے مرنے کا غم تمھیں

ڈھارس بندھاؤ دل کو عبث ہی الم تمھیں
رونا نہ اب مجھے مرے سر کی قسم تمھیں

اشکوں سے میرے غم میں نہ آنکھوں کو تر کرو
دنیا میں کچھ دنوں خوش و ناخوش بسر کرو

سرور جہان آبادی

۲۸- بچّہ کی قبر

بیخبر ماں تجھکو اس بچّے کی بھی ہی کچھ خبر
گود میں تیرے ہمکتا تھا جو کل تک بار بار

گوری گوری اسکی وہ رنگت وہ مکھڑا چاند سا
اور وہ صورت اسکی جس پہ رات دن تھی تو نثار

کل بلائیں لیتی تھی تو دیکھ کر انداز خواب
آج کیوں آتا نہیں سونے پہ اسکے تجھ کو پیار

اُف وہ دہشتناک جنگل اور اندھیاری وہ رات
آہ وہ معصوم بچّہ اور وہ کنجِ مزار

لے خبر لے دیکھ ڈر جائے نہ وہ بچّہ کہیں
کیا اسے آغوش میں لینا ہی تیرا ننگ و عار

کیا ہوئی وہ تیری اُلفت کیا ہوئی وہ مامتا
کیوں نہیں اسکے لیے دل آج تیرا بیقرار

اپنے سینہ سے لگا کر تو سُلاتی تھی جسے
آج وہ ہے اور اک کنجِ لحد تاریک تار

آج لپٹے ہیں اسی میں چند کیڑے قبر کے
جس گلے میں تو نے پہنائے تھے تعویذوں کے ہار

ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے اٹا سب خاک میں
ہائے وہ پیکر جو کل تک تھا ترے زیبِ کنار

جب تری آواز سنتا تھا مچل جاتا تھا وہ
آج وہ ہے اور خموشی چاہے لاکھ اسکو پکار

اک اشارے سے کسی کے ہو گئی ہے آج بند
اس کی وہ آواز جو تھی رشکِ صوتِ ہزار

جس کو پہنایا تھا تو نے جامۂ گل در کل
آج اس کے تن پہ کیڑوں نے کیے نقش و نگار

زندگی میں تو ہر اک عیب و ہنر پر تھی نظر
دیکھ لے یہ حال بھی جا کر بچشمِ اعتبار

عزیز لکھنوی

۳۰- ماں کی بین

ٹک تو پیارے لب کو کھول
غوں غاں کر ما در سے بول

ہے ہے میرے لال انمول جی ماں کا ہے ڈانواں ڈول

تجھ بن میرے نور العین
کیونکر ہو اِس دل کو چین

روتا میں کس کو بہلاؤں دودھ تھپک کر کس کو پلاؤں
چھاتی آگے کس کو سلاؤں جھولے میں اب کس کو جھلاؤں

تجھ بن میرے نور العین
کیونکر ہو اس دل کو چین

بچے کو چڑیا جو گنوائے جنگل جنگل ڈھونڈنے جائے
دانا پانی اِس کو نہ بھائے رین بسیرے نیند نہ آئے

تجھ بن میرے نور العین
کیونکر ہو اس دل کو چین

جاگ پیارے ہوئی اویر سومت "لالا" اتنی دیر
مجھ ماں سے مت انکھیں پھیر زیست سے مجھکو مت کر سیر

تجھ بن میرے نور العین
کیونکر ہو اِس دل کو چین

بیکل اکبرآبادی

۱۳۱۔ ماں کو نزع میں بچّی کا دھیان

(یہ دونوں جگر دوز نظمیں خود جناب محروم کی اہلیہ آنجہانی کے انتقال پُرملال کی یادگار ہیں۔ ودّیا طول عمرہا ان کی معصوم بچّی ہے جس کو ماں نے خوردسال چھوڑا)

کسی کا کون ہے ہمدرد اس زمانہ میں
چلی ہوں چھوڑ کے بے پر کو آشیانہ میں
نہیں ہے عذر مجھے تو جہاں سے جانے میں
قضا کو خاک ملیگا مرے مٹانے میں

نہیں ملال کہ میرا مآل کیا ہوگا
یہ فکر ہے مری ودیا کا حال کیا ہوگا

جو میری آنکھ سے اوجھل ذرا نہ ہوتی تھی
جو میری گود سے دم بھر جدا نہ ہوتی تھی
جو رات آنکھوں میں کٹتی خفا نہ ہوتی تھی
میں اپنی بچّی پہ کس دن فدا نہ ہوتی تھی

ہے کون جو مری نازوں پلی کو پالیگا
کوئی تو خاک سے گوہر مرا اُٹھالیگا

محروم

۳۲۔ معصوم بچّی ماں کی میّت پر

جاگو، اسے اُٹھا لو سو کر اُٹھی ہے دو دیا
کیوں برخلاف عادت رو کر اُٹھی ہے دو دیا

بے تاب اس طرح کیوں رو کر اُٹھی ہے دو دیا
صبر و قرار شاید کھو کر اُٹھی ہے دو دیا

اُس کو بھی غائبانہ معلوم ہو گیا ہے

خوابِ عدم میں تم ہو یا بخت سو گیا ہے

نظروں سے آہ کیا کیا حسرت ٹپک رہی ہے
رہ رہ کے منہ ہمارا حیرت سے دیکھتی ہے

چہرے سے ہی نمایاں دل کی جو بیکلی ہے
تیری تلاش اس کو اے مہر مادری ہے

وہ گود سے ہماری آخر مچل کے نکلی

جاتی ہے کس طرف کو گھٹنوں پہ چلکے نکلی

گھٹنوں پہ چلکے نکلی بستر کے پاس پہنچی
ننھے سے آہ دل میں کچھ لیکے آس پہنچی

کیا مطمئن سنبھالے ہوش و حواس پہنچی
لیکن کچھ اس سے پہلے اس وائے یاس پہنچی

کس کو پکارتی ہے منہ سے کفن اُٹھا کر

منزل پہ ٹھنڈے ٹھنڈے پہنچے وہ لدلدا کر

جی بھر کے دیکھ لے تو مُنہ اپنی پیاری ماں کا　　موقع نہیں ہی دیا یہ ہوں کا اور ہاں کا
مطلب نہیں سمجھتی کیا تو مری فغاں کا　　ٹوٹا ہی ہاتھ تجھ پر بیداد آسماں کا

اب مانگتی ہی دیا غوں غاں کی داد کس سے
کرتی ہی بھولے بھالے دل کو تو شاد کس سے

ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہے　　پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے
اب شمع کشتہ میں کیا تنویر ڈھونڈتی ہی　　کیسے شکار ہٹ سے تقدیر ڈھونڈتی ہی

مردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے
مجھ سخت جاں پہ یارب یہ کیا گزر رہی ہے

لو اُٹھ کے بیٹھو دیا سرہانے آئی ہی　　تمہارے مُنہ سے وہ دامن اُٹھانے آئی ہی
ادائے طفلی کوئی تو دکھانے آئی ہی　　کہ ہنستی آئی ہی تمکو ہنسانے آئی ہی

وہ چل کے آئی ہی گھٹنوں سے تھک گئی ہوگی
تمہارے پیار سی پھر اس کو تازگی ہوگی

اُٹھا بھی لو کہ بہت بیقرار ہی دیا　　نگاہِ مہر کی اُمیدوار ہی دیا

رہینِ سختیِ صد انتظار ہے دو دِیا   نہ چھوڑ جاؤ اسے شیرخوار ہے دو دِیا جلد اول
پکارتی ہے تمھیں آج کس قرینے سے
اُبل کے شیر ٹپکتا نہیں ہے سینے سے

محروم

۳۲۔ یتیم کا پیام ماں کے نام

ایک بچہ جس کی ماں کا ہو گیا تھا انتقال
میرے پاس آیا کہیں سے روتا روتا ایک دن

اور کہا رو رو کر کہ ماں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں
کھانا تک کھایا نہیں ہے صاف گزرا ایک دن

چھوڑ کر بے کس خدا جانے کہاں رخصت ہوئی
ہے بہت مشکل مجھے بے ماں کے جینا ایک دن

تم سے مل جائے تو کہنا مجھ کو بھی لے جائے ساتھ
یا چلی آئے وہاں سے رہ کے دو یا ایک دن

کیسی بستی ہو وہ کیسے گھر ہیں کیسے لوگ ہیں
تو نے تو جا کر وہاں خط بھی نہ بھیجا ایک دن

پیار کرتی منھ دھلاتی کپڑے پہناتی تھی روز
یوں پھٹے کرتے سے میں رہتا نہیں تھا ایک دن

کون چمکارے مجھے اور کون لے آغوش میں
خواب میں بھی تو نے حال آکر نہ پوچھا ایک دن

اپنے سینہ سے کبھی اک دم نہ کرتی تھی جدا
اب یہ تنہا بیکسی میں کیسے چھوڑا ایک دن

اب نہیں کرنے کا ضد اب کچھ نہ مانگوں گا کبھی
خستہ حالی پر مری آ رحم فرما ایک دن

اب نہیں رونے کا رونے سے خفا ہے تو اگر
اچھی اماں گود میں لے لے مجھے آ ایک دن

تجھ کو بن میرے وہاں کٹتے ہیں کیسے روز و شب
مجھ کو بے تیرے یہاں ہے سو برس کا ایک دن

اے خدا ایسے یتیم و بے نوا پر فضل کر
یہ دعا کی اور اکبرؔ خوب رویا ایک دن

اکبرؔ

۳۴۔ یتیم اور گورِ پدر

ننھے ننھے ہاتھ اپنے قبر پر رکھے ہوئے
پڑھ رہا تھا سورۂ الحمد میں باچشمِ تر

دفعتہً امڈا جو دل رو رو کے یہ کہنے لگا
مجھ سے اے بابا خفا تم ہو گئے کیوں اِس قدر

کیا سبب ہی کون سی مجبوریاں درپیش ہیں
اتنی رات آئی ہی اور اب تک نہیں چلتے ہو گھر

سو رہے ہیں اپنے اپنے آشیانوں میں پرند
زمزمے کرتے نہیں اس وقت مرغانِ سحر

ہر طرف سے یہ درندوں کی صدائیں ہولناک

یہ ڈراونی رات یہ قبریں یہ جنگل پر خطر
ہائے یہ عالم کہ دنیا کر رہی ہے سائیں سائیں
اور اکیلا رو رہا ہوں میں تمہاری قبر پر

تم نے چھوڑا تھا کبھی تنہا مجھے ایسی جگہ
گود میں لے لو مجھے معلوم اب ہوتا ہے ڈر

آسماں پر ایک سناٹا سا ہے چھایا ہوا
ڈوبتے تاروں سے پیدا ہیں کچھ آثارِ سحر

میں ہوں اے بابا وہی پروردۂ آغوشِ ناز
لے کے سینے پر جسے سوتے تھے اپنے رات بھر

کیوں کفن میں منھ چھپایا میں وہی منحوس ہوں
دیکھتے تھے منھ مرا تم اُٹھ کے ہنگامِ سحر

منتوں پر منتیں تھیں میرے جینے کے لئے
تھیں دعاؤں پر دعائیں تا نہ لگ جائے نظر

منع کر دیتے تھے فوراً تم اشارے سے مجھے
غیر الفت سے بھی کوئی چیز دیتا تھا اگر

اب وہی ہم ہیں کہ مانگیں بھی تو مل سکتا نہیں
مر گئے تم جب سے ہی ہم پر حقارت کی نظر
خیر اے بابا ذرا یہ بات بھی رکھئے گا یاد
آج باتوں کا مری لیتے نہیں کچھ آپ اثر
روٹھ کر اٹھا ہی تھا چلّا کے میں روتا ہوا
قبر سے آواز آئی اے مرے نورِ نظر
میں فدا تجھ پر ارے یہ کیا غضب تو نے کیا
ایسے ویرانے میں آتا ہی کوئی جانِ پدر
اے مرے نازوں کے پالے میں عجب عالم میں ہوں
گود میں لے کر تجھے کس طرح سے پہنچاؤں گھر
آہ اے معصوم بچّے کیا کروں مجبور ہوں
تیری اِن باتوں سے ٹکڑے ہو گئے قلب و جگر
ہائے ظالم موت تو نے کیا ستم مجھ پر کیا
میرے بچّے ہو گئے یوں تیرے ہاتھوں دربدر

ذ ل تو یہاں آیا کسی نے تجھ کو روکا بھی نہیں
میرے مرتے ہی ہوئے ایسے اعزہ بے خبر
قوم بھی تیری خبر گیری نہیں کرتی ہے کیا
میری جاں ہوتی ہے کیا اب فقر و فاقہ میں بسر
ہائے دنیا سے میں کیا کیا حسرتیں لے کر اُٹھا
تیرا سہرا بھی نہ دیکھا میں نے اے لختِ جگر
سخت مجبوری ہے بیٹا ہم کہاں اور تم کہاں
گھر سدھارو گھر سدھارو وقت ہے یہ پُر خطر
میں بھی زندہ ہوں خدا تجھ کو اگر زندہ رکھے
شاد رہ تو اے مرے نخلِ تمنّا کے ثمر
جا مری جاں جا بس اتنا روح کو صدمہ نہ دے
پھر کبھی آنا مگر تنہا نہ آنا اے پسر
یاد رکھ میری وصیّت اے نہالِ آرزو
قوم کی حلقہ بگوشی میں بسر کر عُمر بھر

ہے تری وابستگی ان سے مرا قومی شرف
چھوڑنا دامن نہ ان کا وہ چھڑائیں بھی اگر

جتنی باتیں میں نے اعجازِ محبت سے کہیں
قوم سے کہنا مری جانب سے اے نورِ نظر

ہو عزیزِ نکتہ پرور کی زبانی یہ پیام
وہ بہت روتا ہے خلوت میں تمہارے حال پر

سب کو پڑھ کر تم سُنا دینا مرا یہ خطِ شوق
مجتمع ہو قوم جس جلسے میں اے جانِ پدر

السلام اے ساکنانِ بزمِ ہستی السلام
اِس جگہ ہم ہیں کہ تم سے کر نہیں سکتے کلام

ہو مُبارک تم کو اِس دنیا کا منظر دیکھنا
جب کبھی فرصت ملے ہم کو بھی مڑ کر دیکھنا

سازو برگِ عالمِ ہستی وہی ہے یا نہیں
یہ تباؤ یاد کرتے ہو ہمیں بھی یا نہیں

آہ وہ لختِ جگر وہ تازہ نخلِ مدّعا
چھُٹ گیا ہی جب سے اور میں ہو گیا اس سی جُدا
اب یہ ہدیہ آرزوے نیکنامی میں دیا
اپنا فرزند آپ کو میں نے غلامی میں دیا
میرے رشتہ سے بھتیجا ہے مگر سمجھو غلام
اِس سے زائد کچھ نہیں کہنا ہے مجھ کو والسلام

عزیزؔ

۳۵۔ کسی کی وصیّت

رنج کرنا نہ میرا میں قرباں	سُن لو گر اپنی جان ہے تو جہاں
دل میں کُڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو	جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تو
آکے رو دینا میری قبر کے پاس	تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا	قبر میری گلے لگا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر	پڑھنا قرآن میری تربت پر

غنچۂ دل مرا کھلا جانا پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں یوں نہ ہو جائے دشمنوں کو جنوں
میرے مرقد پہ رونے آنا تم فاتحہ سے نہ ہاتھ اُٹھانا تم
ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے
دل پہ کچھ آنے دیجیو نہ ملال خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
رنج و راحت جہاں میں توام ہے کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے
ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ کسی جا ہے صدائے نالہ و آہ
مرگ کا کس کو انتظار نہیں زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو آج دل کھول کے گلے مل لو
حشر تک پھر یہ ہو گی بات کہاں ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں
خاک میں ملتی ہے یہ صورت عیش پھر کہاں ہم کہاں یہ صورت عیش
ختم ہوتی ہے زندگانی آج خاک میں ملتی ہے جوانی آج

چین دل کو نہ آئے گا تم بن
اب کے بچھڑے ملینگے حشر کے دن

مرزا شوق

۳۶- کسی کا جنازہ

آگے آگے ہی کچھ جلوس رواں — سر کھلے پیچھے پیچھے پیر و جواں

سن رسیدہ ہیں عورتیں کچھ ساتھ — سینہ و سر پہ مارتی ہیں ہاتھ

کوئی ماما ہے کوئی دائی ہے — کوئی انّا کوئی کھلائی ہے

جب وہ بھرتی ہیں غم سے آہِ سرد — سننے والوں کے دل میں ہوتا ہے درد

ہوتا ہے غیروں کو ملال ان کا — دیکھا جاتا نہیں ہے حال ان کا

اس کے پیچھے پڑی پھر اس پہ نگاہ — کہ نہ دیکھے بشر معاذ اللہ

تھی پڑی اس پہ ایک چادرِ گل — جس سے خوشبو وہ راہ تھی بالکل

بھیڑ تابوت کے تھی ایسے ساتھ — جیسے آگے کسی دلہن کے برات

سب وضیع و شریف تھے ہمراہ — بھیڑ تھی اس قدر کہ بند تھی راہ

پیچھے پیچھے تھا سب کے سوداگر — مو پریشاں اداس خاک بسر

آگے آگے جنازہ جاتا تھا — غش اسے ہر قدم پہ آتا تھا

ہاتھ تھامے تھے اقربا سارے — تا کسی جا پہ سر نہ دے مارے

حال اس درجہ ہو رہا تھا زبوں — بہتا جاتا سر کے زخم سے خوں

سب امیر و فقیر روتے تھے | دیکھ کر راہ گیر روتے تھے
پیچھے سب کے فنیس میں تھی مادر | کہتی جاتی تھی اس طرح روکر
تیری میّت پہ ہو گئی ہیں نثار | کم سخن ہائے میری غیرت دار
کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو | کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل پہ جو گزری کچھ بیان نہ کی | کچھ وصیّت بھی میری جان نہ کی
دل ضعیفی میں میرا توڑ گئی | بیٹا اِس ماں کو کس پہ چھوڑ گئی
تازہ پیدا جگر کا داغ ہوا | گھر مرا آج بے چراغ ہوا
دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے | جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
زہر دیدو کوئی میں کھا جاؤں | یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں
داغ تیرا جگر جلاتا ہے | چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے
مِٹ گیا لطف زندگانی کا | دل کو غم ہے تری جوانی کا
بیاہ تیرا رچانے پائی نہیں | کوئی منّت بڑھانے پائی نہیں
تیری صورت کے ہو گئی قرباں | چلیں دنیا سے کیسی پُر ارماں
ہوئیں کس بات پر خفا بولو | امّاں، واری ذرا جواب تو دو
بولتی تم نہیں پکارے سے | اب جیونگی میں کس سہارے سے

کیا قضا نے جگر یہ داغ دیا
آج گھر میرا بے چراغ کیا

نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارماں
ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پروان

ایسی اس ماں سے ہوگئیں بیزار
لی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار

نہ جیونگی ترے فراق میں میں
دل تڑپتا ہے آنکھیں ڈھونڈتی ہیں

کس مصیبت میں پڑ گئی بیٹا
کوکھ میری اجڑ گئی بیٹا

عمر کٹنی تھی ایسے صدمے میں
ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

مرزا شوق

۳۷۔ مزار

دنیا کا طریقہ ہے کہ جب مرتا ہے انساں
رو دھو کے غرض کرتے ہیں تکفین کا ساماں

لیجاتے ہیں سب ملکے سوئے شہرِ خموشاں
ہاتھوں سے تہِ خاک اسے کرتے ہیں پنہاں

مٹی کا لگا دیتے ہیں انبار گراں ایک
کہتے ہیں موئے آدمی کا ہے یہ نشاں ایک

کرتا ہے اگر تنگ بہت ہی دلِ مضطر
بیساختہ تربت سے لپٹ جاتے ہیں جاکر

دو پھول چڑھا دیتے ہیں بیکس کی لحد پر — کرتے ہیں خطاب اس سے کبھی رو رو کے دو دن بھی — جلد اوّل

فی الجملہ حرارت تو نکل جاتی ہے دل کی
گو کچھ نہ ہو، ہوتی ہے مگر پھر بھی تسلّی

امجد

۳۸- مزارِ دوست

قبر پر الحمد پڑھکر دوست سے میں نے کہا — ہم گریباں چاک ماتم میں ترے دل دادہ ہیں
شاد ہے کچھ تو بھی زیرِ خاک اے نازک بدن — شمع روشن ہیں گلوں سے قبر پرانبار ہیں
کیا ہوا مرنے کے بعد اے راہی ملکِ عدم — لوگ کیسے ہیں وہاں کے اور کیا اطوار ہیں
منزلیں نزدیک ہیں یا دور ہیں کیا حال ہے — راہ میں کچھ بستیاں ہیں شہر ہیں بازار ہیں
جس محل میں جا کے تو اُترا ہے اے رنگیں ادا — کس طرح کا قصر ہے کیسے در و دیوار ہیں
اہلِ صحبت کون ہیں کیا گفتگو کا طرز ہے — خوش بیاں خوش وضع یا کج فہم بد گفتار ہیں
بات کرنے کی صدا اصلا کبھی آتی نہیں — کس طرح کے لوگ ہیں سوتے ہیں یا بیدار ہیں
قبر سے آئی صدا اے دوست بس خاموش رہ — ہم اکیلے ہیں یہاں احباب نہ اغیار ہیں
پھول کیسے باغ کیسا عقل تیری ہے کہاں — کنج تنہائی ہے اور افعی گلے کا ہار ہیں

گر تمہیں دو پیکر نازک ہمارا یاد ہو
آج خاکِ قبر سے اس پر منوں کی بار ہیں
اب زیادہ بات کرسکتے نہیں لے گھر کو جا
دل میں آزردہ نہ ہونا کیا کریں لاچار ہیں

۱۹۰۴ع

۳۹۔ خوابِ قبر

آسودگی بہ گوشۂ ہستی نہ دیدہ ایم
جاں دادہ ایم و کنج مزارے خریدہ ایم

اے موت بندِ ہستی سے تو چھڑا دے مجھکو
آزاد کرکے اپنا بندہ بنا دے مجھکو
صہبائے بیخودی کے ساغر پلا دے مجھکو
آ حجرۂ لحد میں چل کر سلا دے مجھکو

اے قبر اک مدّت سے وصل کا ہی ارماں
آغوشِ دل میں لے لے شفقت پہ تیری قرباں

سنسان مقبرہ ہو ہر سو ہو، ہو کا عالم
اور لہلہا رہا ہو سبزے کا ایک پرچم
ہر پھول داغِ غم ہو ہر نخل نخلِ ماتم
آنسو بہا رہی ہو تربت پہ میری شبنم
تنہائی ہو محافظ خاکی مکان کی میری
اور بیکسی ہو دربان اس آستانی میری

میں ہوں فقط اکیلا کچھ مال ہو نہ زر ہو
دو گز کا اک کفن ہو، کچھ پاس اپنے گر ہو

کپڑا سفید سر سے پا تک تنا ہوا ہو
ڈھیلوں سے ایک تکیہ سر سے مرے لگا ہو

وہ دن کب آئینگے جب احباب رو رہے ہونگے
ہم اپنا منھ لپیٹے بیفکر سوتے ہونگے

محمد اسلم عظیم آبادی

۴۰۔ کفن دفن

تنِ مُردہ کو کیا تکلّف سے رکھنا
گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا

کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشیّن بدن تھا معطّر کفن تھا

جو قبر کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا
نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

نظیر اکبرآبادی

۴۱- قبرستان

ایک دن گورِ غریباں میں ہوا میرا گزر — دل کے داغ ابھرے ہوئے دیکھے بساطِ خاک پر

ہنس رہی تھیں جابجا ٹوٹی ہوئی قبریں جہاں — عالمِ اسباب کی نیرنگیوں کو دیکھ کر

ان کی قبروں پر کہ جو تھے مجلس آرائے وجود — شمع روشن تھی نہ تھی اک چادرِ گلہائے تر

رو رہی تھیں صرف ناکامی پر ان کی حسرتیں — کوئی ماتم کرنے والا تھا نہ کوئی نوحہ گر

ہو کا عالم اور بھیانک رات اور وہ بیکسی — ہل گیا دل عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر

خونِ دل بہنے لگا آنکھوں سے دھیان آیا مجھے — دفن اس عبرت سرا میں ہے مرا مشفق پدر

یہ خیال آتے ہی دوڑا ایک تربت کی طرف — فاتحہ پڑھنے کو تنہا خاک بر سر نوحہ گر

قبر کے ذرات کو دی جذبِ دل نے زندگی
خاک میں جنبش ادھر تھی ہل رہا تھا دل ادھر

عزیز

۴۲ - ملکہ نور جہاں کا مزار

ہاں اے لبِ راوی بتا کچھ رفتگاں کا ماجرا
کل تجھ پہ جن کا راج تھا، انجام اُن کا کیا ہوا
ہے اب کہاں نور جہان، حورِ جناں عصمت کی جاں
وہ بلبلِ شیریں زباں وہ قمریِ ہندوستاں
تیرے کنارے ہے پڑا ٹوٹا سا جسکا آشیاں عبرت فشاں عبرت نشاں
شوکت تھی جس کی پاسباں، چاکر سے تھے جاہ و حشم
تھی بحر و بر کی سب سپہ حاضر لیے تیغِ دو دم
خیل و خدم ناز و نعم رخت و خیم طبل و علم
افسوس رکھے رہ گئے خود چل دیئے سوئے عدم
عالم میں ہے کس کو بقا، نامِ بقا کس نے لیا، قصرِ فنا ہے آسماں
آئی کہاں سے موت تو ایوانِ شاہی میں بھلا
کیا پاسباں حاضر نہ تھے جو روکتے تیرا گزر

اوّل ہاں پر تری پرواز کا آیا نہیں اِن کو نظر
یوں کھینچ کر لے جاتی ہی انساں سے اسکی روح کو
اُڑ جاتی ہی جیسے مگس گُل سے عسل کو سینچ کر
یا ہنس ہو جیسے ہَوا ڈنٹھل سے ریشہ کھینچ کر
رہتا ہی باقی برزمیں، افسردہ گل بے انگبیں، بیجان جسم ناتواں
تضحیک چرخِ پُر جفا دیکھو عیاں ہے برملا
ہی جس جگہ وہ مہ لقا جالا ہے مکڑی نے بنا
تا سائباں کا کام دے بیگم کے شاہی تاج پر
دو چار باقی پیڑ ہیں یا ٹہنیوں کے ڈھیر ہیں
یا چر رہی ہیں بکریاں یا بُوم کا ہے آشیاں
شاہی شکوہ و عز و شاں اُڑ جاتے ہیں شبنم صفت
باقی نہیں رہتا نشاں
دنیا نے گو چھوڑا مگر خدمت میں ہی پھر مگر
دیتی ہی پہرا رات بھر تربت پہ اس کے چاندنی
وہ بیگم زہرہ جبیں مرقد سے باہر آن کر

اور لے کے مشعل ماہ کی جاتی ہی جانب شاہ کی

جلد اوّل

حالت نہ پوچھو راہ کی آنسو نکلتے جاتے ہیں
اور پھول کھلتے جاتے ہیں جب بچھڑے ملتی جاتی ہیں

ہوتا غضب کا ہی سماں

اور جب اندھیری رات ہو تربت ہی اسکی بھاتی ہی
شبنم کہیں آجاتی ہی موتی کا سہرا لاتی ہی

دیتا ہی جگنو ٹمٹما گورِ غریباں پر دیا
شاخیں بڑھا کر ہاتھ کو پڑھتی ہیں گویا فاتحہ

پتّے سٹک رہ جاتے ہیں آتی ہی جب ٹھنڈی ہوا
حیرت کا بھی دھڑکے ہی دل ہاں دیکھ کر ایسا سماں

عبرت نگاہی چاہیئے انجام ہی یہ بے گماں
گو اس میں ہو شاہ جہاں یا بادشاہِ این و آں

ہوتا ہی تربت میں نہاں

دل

۴۳- ملکۂ نور جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہہ نور جہاں ہے
مدّت ہوئی وہ شمع تہہ خاک نہاں ہے
اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شبِ دیجور کا عالم

اے حُسنِ جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گُل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے

تُجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بیچارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کُٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذ لحد ہی زبر و زیر یہ اندھیر · یہ دَورِ زمانہ کے اُلٹ پھیر یہ اندھیر

آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر اندھیر · اے گردشِ ایام یہ اندھیر یہ اندھیر

ماہِ فلکِ حُسن کو یہ بُرج ملا ہے

اے چرخ تری ہیچ نوازی کا گلا ہے

حسرت ہی ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا · ہوتا ہی اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا

نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا · اُٹھتے ہیں شرر آہ شرر بار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارہ

ہی تجھ سی حسینہ کے لیے ہُو کا نظارہ

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر · آرام لیا کرتے ہیں اس روضہ میں آکر

اور شام کو بالائے سیہ خانوں سے شپّر · اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر

معمور ہی یوں محفلِ جانانہ کسی کی

آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

آراستہ جن کے لیے گلزار چمن تھے · جو نازکی میں داغ دہ برگِ سمن تھے

جو گل رخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے · شاداب گُلِ تر سے کہیں جنکے بدن تھے

جلد اوّل

پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لیے دیدہ و دل جنکے مکاں تھے
جو پیکرِ ہستی کے لیے روحِ رواں تھے

محبوبِ دلِ خلق تھے جاں بخشِ جہاں تھے
تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں
ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں

باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحلِ اوہ یہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

محروم

۴۴۔ گورِ غریباں

ہم نے دیکھا جب پڑی گورِ غریباں پر نظر
فرشِ گل کے سونے والے سو رہے ہیں خاک پر

مونس و غمخوار جتنے تھے کنارہ کر گئے
آج کوئی نوحہ گر ان کا نہیں آتا نظر

فاتحہ کو بھی نہ آئے قبر تک وہ آشنا
زندگی میں جو کہ رہتے تھے بہم شیر و شکر

مال و زر یوں ہی پڑا رہ جائیگا سب دہر میں
کام آئیگا وہی رکھا ہے جو زادِ سفر

ایک دن ہے خاک میں ملنا یہ سب کچھ خاک ہے
دولتِ دنیا پہ نازاں کیوں ہے انساں اسقدر

وجد

۵۴۔ گورِ غریباں

انگریزی شاعر گرے کی مشہورِ آفاق نظم ایلیجی کا ترجمہ جو بہت مقبول ہوا

اصل نظم سے مقابلہ کرنے پر ترجمہ کی پوری خوبی معلوم ہوتی ہے

وداعِ روزِ روشن ہے گجرِ شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اُٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دُنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اُٹھا کر آنکھ ادھر اک ہو کا عالم ہے
مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دُور سے پیہم کبھی آواز آتی ہے

کبھی اک گنبدِ کہنہ پہ بومِ خانماں ویراں
فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دُنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنجِ تنہائی میں دھرتا ہے

قطار اک سامنے ہے مولسریوں کے درختوں کی
وہاں قبریں ہیں کچھ مٹی کے جیسے ڈھیر ہوتے ہیں
ہر اک نے مر کے بس دو گز کفن دو گز زمیں پائی
بسانے والے جو اس گاؤں کے تھے سب وہ سوتے ہیں

نفسِ بادِ سحر کا نالۂ پُر دردِ بلبل کا
ہوئے بیکار سب ان کو اُٹھا سکتا نہیں کوئی
رہی بے فائدہ مستوں کی ہُو حق شورِ قلقل کا
ہیں ایسے نیند کے ماتے جگا سکتا نہیں کوئی

نہ چولھے آگ ہے روشن نہ اب ان کے گھڑے پانی
نہ گھر والوں کو اب کچھ کام ہے فکرِ شبستاں سے

نہ بی بی کو سرِ شام انتظار اب ہے نہ حیرانی
نہ بچے دوڑتے ہیں اب کہ لپٹیں آ کے داماں سے

وہی ہیں یہ جنھیں دقتِ درو مہلت نہ تھی دم بھر
وہی ہیں ہاتھ چلتے رہتے ہی تھے بشتر جن کے

وہی ہیں یہ جنھوں نے ہل چلائے گیت گا گا کر
بڑی سرکش درختوں کو گراتے تھے تبر جن کے

نہ دیکھیں حال ان لوگوں کا ذلت کی نگاہوں سے
بھرا ہے جن کے سر میں غرّۂ نوابی و خانی

یہ ان کا کاسۂ سر کہہ رہا ہے کج کلاہوں سے
عجب ناداں ہیں جن کو ہے عجب تاج سلطانی

نہیں شایاں فخر و نازِ نوبت اور نقارہ
جو نازاں جاہ و ثروت پر ہیں ان پر موت ہنستی ہے

وہ ساعت آنے والی ہے نہیں جس سے کوئی چارہ
کہ فانی ہے جہاں ہر اوج کا انجام پستی ہے

نظر آتے نہیں کتبے مزاروں پر تو کیا غم ہے
چراغاں اور صندل اور گل و ریحاں نہ ہو تو کیا

نہیں نگیں اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے
جو خوش آہنگ کوئی قاریِ قرآں نہ ہو تو کیا

بناتے ہو بہ ہو تصویر اگر مدفن پہ رکھنے کو
پلٹ کر اس سے کچھ نکلی ہوئی سانس آ نہیں سکتی

دعا ہو فاتحہ ہو مرثیہ ہو آہ و زاری ہو
کوئی آواز ان کے کان تک اب جا نہیں سکتی

خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہرِ قابل
خدا معلوم رکھتے ہوں گے یہ ذہنِ رسا کیسے

خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہوں گے صاحب دل
خدا معلوم ہوں گے بازوئے زور آزما کیسے

زمانہ نے مگر کوئی ورق ایسا نہیں الٹا
کہ بارِ فکر سے مہلت یہ پاتے سر اٹھانے کی

مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کیا پسپا
کہ بار آنے نہ پائی جوہرِ ذاتی دکھانے کی

بہت سے گوہرِ شہوار باقی رہ گئے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشتِ دور میں ایسے کھلے ہوں گے
کہ جن کے مسکرانے میں تھی خوشبو مشک اذفر کی

یہ صاحب عزم ہیں گو رزم کی نوبت نہیں آئی
حکومت اپنی قریہ میں کی لیکن دوست دشمن پر
وہ فردوسی یہ ہیں جن کی زباں کھلنے نہیں پائی
وہ رستم ہیں نہیں سہراب کا خوں جن کی گردن پر

مقدر نے انھیں مصروف رکھا قلبہ رانی میں
وگرنہ حکمرانی کا بھی جلوہ یہ دکھا دیتے
عجب کیا شہرۂ آفاق ہوتے خوش بیانی میں
اور اپنے کارنامے اہل عالم کو سنا دیتے

رہی محروم نیکی سے بچے ہر اک برائی سے
نہ زورِ مردم آزاری نہ شورِ فتنہ انگیزی
نہ دولت کی طمع میں بے گناہوں کے گلے کاٹے
نہ کی خلقِ خدا کے ساتھ بیرحمی و خونریزی

نہ صحبت میں امیروں کی کبھی خونِ جگر کھایا
نہ اوٹا یا لہو اپنا کبھی جھوٹی خوشامد سے
نہ مل کر روغنِ قاز آتشِ نخوت کو بھڑکایا
کہ جس سے خود پسندوں کا تبختر بڑھ چلے حد سے

الگ ہر نیک و بد سے دور دنیا کے مکاید سے
گئے بیگانہ وار اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ ابنائے زمانہ کے مفاسد سے
قدم راہِ توکل سے کبھی ڈگنے نہیں پائے

نہ دیکھ ان استخواں ہائے شکستہ کو حقارت سے
یہ ہے گورِ غریباں اک نظر حسرت سے کرتا جا
نکلتا ہے یہ مطلب لوحِ تربت کی عبارت سے
جو اس رستے گزرتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتا جا

لکھے ہیں نام ان قبروں پہ گو کاواک حرفوں میں
مگر بھولے ہوئے کو ٹھیک رستہ یہ بتاتے ہیں

زیادہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا اگر سوچیں — کہ جو مرنے سے ناواقف ہیں رستہ سیکھ جاتے ہیں

جو آیا ہے جہاں میں یاں سے جانا ہے اسے اک دن — یہ ہونا ہے کوئی چاہے گا دل سے یا نہ چاہے گا
مگر جاتے ہوئے پھر کر نہ دیکھے یہ نہیں ممکن — دلوں سے یاد بھی مٹ جائے یہ حاشا نہ جائے گا

کوئی زانو کسی کا ڈھونڈتا ہے دم نکلنے کو — کہ کچھ اشک گرتی چاہنے والے کے دامن میں
کسی کی ہے یہ خواہش دوست کاندھا دیں جنازے کو — پھر اس پر فاتحہ کی آرزو ہے کنج مدفن میں

حقیقت غور سے دیکھی جوان سب مرنے والوں کی — تو ایسا ہی نظر آنے لگا انجام کار اپنا
انھیں کی طرح جیسے مل گئے ہیں خاک میں ہم بھی — یوں ہی پرسان حال آنکلا ہے اک دوستدار اپنا

یہ اس سے ایک دہقان کہن سال آکے کہتا ہے — کہ ہاں ہاں خوب ہم واقف ہیں دیکھا ہے اسے اکثر
پھر اس کے بعد دل ہی دل میں کچھ غم کھا کے کہتا ہے — کہ اب تک پھرتا ہے آنکھوں میں پھرنا اس کا سبزہ پر

وہ اس کا نور کے تڑکے ادھر گلگشت کو آنا — وہ پو پھٹنے سے پہلے آکے پھرنا سبزہ زاروں میں
وہ کچھ کم دن رہے اس کا لب جو کی طرف جانا — وہ اس کا مسکرانا دیکھکر شور آبشاروں میں

کبھی ایسی ہنسی لب پر کہ ظاہر جس سے کچھ نفرت — اور اس کے ساتھ ہی کچھ زیر لب کہتے ہوئے جانا
کبھی تیوری چڑھا کے منہ بنائے رنج کی صورت — کہ جیسے دل پہ صدمہ ہے زباں جس سے ہے بیگانا

غرض کیا کیا کہوں اک روز کا یہ ذکر ہے صاحب — کہ اس میدان میں پھرتے صبحدم اس کو نہیں دیکھا
ہوا پھر دوسرا دن اور نظر سے وہ رہا غائب — خیاباں میں اسے پایا نہ دریا پر کہیں دیکھا

پھر اس کی تیسرے دن دیکھا کیا ہوں جنازے کو — لئے آتے ہیں سب پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت کا
تمھیں پڑھنا تو آتا ہوگا آؤ پاس سے دیکھو — یہ اس کی قبر ہی اور یہ کتابہ سنگ تربت کا

اب آغوشِ لحد میں سو رہا ہے چین سے کیسا — گیا افسوس لیکن یہ جواں ناکام دُنیا سے
دکھایا جاہ و شہرت نے نہ بھولے سے بھی منہ اپنا — پھر ایسے نامُرادوں کو بھلا کیا کام دنیا سے

ہر اک کے درد دکھ سے اس کو رہتا تھا سدا مطلب — ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشک باری کی
دیا دستِ تہی کے ساتھ طینت میں کرم یا رب — میں تیری شان کے قربان کیا اچھی تلافی کی

خدا بخشے اسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا — تو نکلا دوست اک آخر خداوندِ کریم اس کا
اب اس کی نیک و بد کا ذکر کرتا ہی نہیں اچّھا — کہ روشن ہے خدا پر عالمِ اُمید و بیم اس کا

نظم طباطبائی

۴۶۔ شہرِ خموشاں

کل سُوئے گورِ غریباں جو ہوا میرا گزر — ہوگیا پیشِ نظر عالمِ ہو کا منظر
اپنی روداد سُناتے تھے لحد کے کتبے — ایک افسانۂ عبرت تھے وہ خاموش کھنڈر
جن کے پرچم تھے فتحمندی و نصرت کی دلیل — جن کی شمشیر سے اقبال کے جھڑتے تھے شرر
جن کی سطوت سے دلیروں کے تھے پتّے پانی — جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے شیروں کے جگر

جن کی عظمت کا جہاں بھر میں بجا تھا ڈنکا — جن کا سکّہ تھا رواں دہر میں کشور کشور
ماند تھی محفلِ جم بزمِ طرب سے جن کے — شمعِ محفل تھے جہاں اہلِ خرد اہلِ نظر
جن کے دروازے سے دولت کا نشاں ملتا تھا — کسی گنتی میں نہ تھے سیم و زر و لعل و گہر

مستمندوں کے لئے وقف تھی جن کی دولت
ایک توجہ میں سنور جاتے تھے بگڑے ہوئے گھر

جن کی یہ آن تھی یہ شان تھی یہ شوکت تھی — جن کی تمکین سے تھی بزم جہاں زیر و زبر
حیف صد حیف وہ تھی گورِ غریباں کے مکیں — دفن تھی خاک میں اور خاک تھی ان کے اوپر
ان کے قبروں پہ جو گنبد تھے شکستہ تھے بہت — اینٹ مٹی سے تو چونے سے جدا تھے پتھر

بوم تھے گنبدِ شاہی کے نگہبانوں میں
بیکسی مرثیہ خواں تھی لحدِ شاہاں پر

یہ سماں دیکھ مرا درد سے جی بھر آیا — اور وہیں بیٹھ گیا خاک پہ میں تیورا کر
کس نے اس شہرِ خموشاں کی بِنا ڈالی ہے — خاک پر کس لئے بکھرے ہیں یہ اعلیٰ گوہر
سُن کے یہ بات ”فنا“ مجھسے ہوئی یوں گویا — کیا ہوا پڑ گئے کیوں تیری سمجھ پر پتھر
کس میں قدرت ہے کہ کرے گلشنِ عالم تاراج — کس کی طاقت ہے کرے نظمِ جہاں زیر و زبر
کس کی ہستی ہے جو کہلائے خداوندِ جہاں — ہاں مگر ایک ”خداوند“ خدائے اکبر

اس کو زیبا ہے شہنشاہی کونین کہ وہ ایسا بے مثل ہے جس کا نہیں کوئی ہمسر

اس کی توحید کے گاتے ہیں ترانے شب و روز فرش سے عرش تلک حور و ملک جن و بشر

ذرہ ذرہ سے عیاں شانِ خدائی یکتا قطرہ قطرہ پہ رواں حکم خدائی برتر

جس کو چاہے اسے دنیا میں سرفراز کرے جس کو چاہے اسے ذلت سے کرے خوار ابتر

جس کو چاہے اسے دے سلطنت و تاج و سریر جس کو چاہے وہ کرے خاک نشیں خاک بسر

تاج والے ہی رہیں گے نہ یہاں باجگزار چل سکے گی نہ حکومت نہ یہاں زور نہ زر

اس کی قدرت کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ میں تاج شاہی پہ لگاتی ہوں ہمیشہ ٹھوکر

کاشہ سے تا فلک جزو سے لے کر کل تک سب پہ چلتا ہے عمل میرا بہ فرمانِ قدر

میں نے ہی "شہر خموشاں" کی بنا ڈالی ہے

میرے ہی زیر اثر تو ہیں یہ سب گنبد و در

۹

۷۴۔ فنا

ہے یقیں اس کا کہ اک دن یہ گماں کچھ بھی نہیں یہ زمیں کچھ بھی نہیں یہ آسماں کچھ بھی نہیں

کیا ہے انساں ایک مشتِ استخواں کچھ بھی نہیں بلبلا پانی کا ہے عمرِ رواں کچھ بھی نہیں

سب ہیں فانی کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں اک خدا کو ہے بقا دونوں جہاں کچھ بھی نہیں

زندگی تک ایک عالم جن کے تھا زیرِ نگیں بعد مُردن ان کا اب نام و نشاں کچھ بھی نہیں
رنگ کیا فصلِ خزاں لائیگی رکھ اس کا خیال پھول کی دو دن بہار اے باغباں کچھ بھی نہیں
آہ سے مظلوم کی ڈر ظالمِ نخوت پرست سامنے جس کے زمین و آسماں کچھ بھی نہیں
کیسی نادانی ہے کارِ خیر میں کرتا ہی ڈھیل
موت کے تو سامنے پیر و جواں کچھ بھی نہیں

ذھین

۴۴۔ فنا

سامنے آنکھوں کے دریا سبز لہراتا ہوا نازسے جھونکا نسیمِ صبح کا آتا ہوا
برف کی وردی میں لشکر ابر کا جاتا ہوا موسمِ گلہائے رنگیں دل کو ترپاتا ہوا
اپنے اپنے وقت پر ہر اک فنا ہو جائے گا
دیکھ لینا چار دن میں کیا سے کیا ہو جائے گا
پھر نہ بحرِ نیلگوں اس لطف سے لہرائے گا نے کوئی جھونکا ہوا کا باغ میں پھر آئے گا
ابر کا ٹکڑا الگ صورت نہ پھر دکھلائے گا شیشۂ دل سنگِ ناکامی سے ٹکر کھائے گا
نام رہ جائے گا باقی بس خدائے پاک کا
نقش وہ مٹ کر رہے گا جو بنا ہے خاک کا

جا چکی ہم سے ہمیشہ کے لئے فصلِ بہار — موت دروازہ پہ کرتی ہے ہمارا انتظار
چھوٹتے جاتے ہیں بزمِ عیش یارِ غمگسار — ہم کو بھی جانا پڑے گا ہو گی جب اپنی پکار

گردشِ چرخِ بریں نیچا ہمیں دکھلائے گی
مادرِ گیتی ہمیں آغوش میں بٹھلائے گی

جس جگہ احباب کی اپنے رسائی تک نہیں — بزمِ عشرت کی صدا جس گھر میں آئی تک نہیں
نغمۂ بلبل جہاں دیتا سنائی تک نہیں — بھول کر جس جا نسیمِ صبح آئی تک نہیں

ایسے ویراں گھر میں ہم کو چھوڑ جائیں گے عزیز
بعد مُردن ہم نہیں گو یار ہے ان کے عزیز

عالمِ پیری ہے چہرہ ہو گیا ہے زرد فام — دانت رخصت ہو گئے بازو نہیں دیتے ہیں کام
جسم ٹھنڈا ہو گیا ہے موت کا پہنچا پیام — کوس رحلت بج گیا اپنا بھی یارو والسلام

مادرِ گیتی یوں ہی اک دن فنا ہو جائے گی
چار دن میں آب و تاب اس کی ہوا ہو جائے گی

ہم نہیں دنیا میں جب بادِ نسیم آیا کرے — موجِ بحرِ نیلگوں سر اپنا ٹکرایا کرے
صبحِ عشرت آسماں سے نور برسایا کرے — شامِ وصلت عاشقوں کو لطف دکھلایا کرے

ہم کو کافی ہے زمیں دو ہاتھ سونے کے لئے
فرشِ خاکی خوب ہے اپنے بچھونے کے لئے

۴۹- محبّت

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور — نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبّت مسبّب محبت سبب — محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبّت بن اس جا نہ آیا کوئی — محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبّت ہی اس کارخانہ میں ہے — محبّت سے سب کچھ زمانہ میں ہے
محبّت سے کس کو ہوا ہے فراغ — محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ
محبّت اگر کار پرداز ہو — دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو
محبّت عجب خواب خونریز ہے — محبّت بلائے دل آویز ہے
محبّت کی ہیں کار پردازیاں — کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں
محبّت کی آتش سے اخگر ہے دل — محبّت نہ ہوئی تو پتھر ہے دل
محبت ہی سے دل کو رو بیٹھئے — محبّت میں جی مفت کھو بیٹھئے
محبّت لگاتی ہے پانی میں آگ — محبت سے ہی تیغ و گردن میں لاگ
محبّت سے ہے انتظامِ جہاں — محبّت سے گردش میں ہے آسماں
محبّت سے روتے گئے یار خوں — محبّت سے ہو ہو گیا ہے جنوں

محبت سے پروانہ آتش بجاں | محبت سے بلبل ہے گرمِ فغاں
اسی آگ سے شمع کو ہے گداز
اسی کے لئے گُل ہے سرگرمِ ناز

حسین

۵۰۔ آغازِ حُسن و عشق

یاد کرو وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا | باوجودِ حُسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشق روز افزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی | جلوۂ رنگیں پہ تجھکو نازِ یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میری عشق کی بھی سادگی | جبکہ تیرا حُسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھی حُسن و عشق | ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا
تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رُسوائی نہ تھا

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے | دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا | اور مجھی حاصل تھی لطفِ بے نہایت کے مزے
حُسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے | اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
یاد ہیں وہ حسنِ الفت کی نرالی شوخیاں التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

صحبتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

حسرت

۵۱- اختلاط

ہو چکا وعدہ کہ کل آئیے گا دیکھئے اب نہ بدل جائیے گا
وعدہ آنے کا جو فرمائیے گا جیسے آج آئے تھے کل آئیے گا
اتنی گھر جانے کی جلدی کیا ہے بیٹھئے جائیے گا جائیے گا
کہتے ہیں کہہ تو دیا آئیں گے اب یہ کیا چڑ ہے کہ کب آئیے گا

رات اپنی ہے ٹھہریئے تو ذرا
آئیے بیٹھئے، گھر جائیے گا

امیر

۵۲- ولولۂ عشق

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

غالبؔ

۵۳- ولولۂ عشق

پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں
سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے

مرغِ بسمل کی طرح لوٹ گیا دل میرا
نگہِ ناز کی تاثیر بھی کیا ہوتی ہے

درد اوّل
خود سمجھتا ہوں کہ رونے سے بھلا کیا حاصل پر کروں کیا یوں ہی تسکین ذرا ہوتی ہے
نالہ کرلینے دیں للہ نہ چھیڑیں احباب
ضبط کرتا ہوں تو تکلیف سوا ہوتی ہے

اکبر

۵۴- کارنامۂ عشق

زہے عشق نیرنگ سازی تری — کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری
تجھی سے ہے آبِ رُخِ زرد زرد — تجھی سے مرے دل میں اُٹھتا ہے درد
تجھی سے ہے بلبل کو نوحہ گری — تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری
تجھی سے دلِ شاد غمناک ہے — تجھی سے مرا سینہ صد چاک ہے
تجھی سے ہے مجنون صحرا نورد — تجھی سے ہے فرہاد کوہوں پہ مرد
تجھی سے دلِ عاشقاں ہے کباب — تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب
ترا کام دینا ہے بدنامیاں — تری ریجھ دیکھی ہیں ناکامیاں
تجھی میں ہیں یہ کار پردازیاں
تجھی پر ہے موقوف جانبازیاں

عزیز

۵۵۔ کارنامۂ عشق

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا ۔ جس گھر سے سر اٹھایا، اس کو بٹھا کے چھوڑا

ابرار تجھ سے ترساں، احرار تجھ سے لرزاں ۔ جو زد پہ تیری آیا اُس کو گرا کے چھوڑا

راجوں کے راج چھینے شاہوں کے تخت چھینے ۔ گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ ۔ جو گنج تو نے تاکا اُس کو لٹا کے چھوڑا

جس رہ گزر میں بیٹھا تو غول راہ بن کر ۔ صنعاں سے رہ رست رو کو رستہ بُھلا کے چھوڑا

فرہاد کوہ کن کی لی تو نے جانِ شیریں ۔ اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوب سے بشر کو دی تو نے ناصبوری ۔ یوسف سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دل گداز تیرے ۔ پتھر کے دل تھے جن کے ان کو رُلا کے چھوڑا

عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی ۔ عقل و خرد کا تو نے خاکا اُڑا کے چھوڑا

علم و ادب رہے ہیں دبے ترے ہمیشہ ۔ ہر معرکہ میں تو نے ان کو رلا کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش ۔ شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اک دسترس سے تیری حالیؔ بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

۱۸۹۳ء

۵۶- کارنامۂ عشق

عشقِ آفاتِ آسمانی ہے برسوں لوگوں نے خاک چھانی ہے
رنگ چہرے کا زردان سے ہے دل میں جن کے ہے دردان سے ہے
دل ہیں داغوں سے خانہ باغ کئے گھر کے گھر اس نے بے چراغ کئے
سیکڑوں جی سے کھو دیئے اس نے لاکھوں بیڑے ڈبو دیئے اس نے
سو گریبانِ صبر پھٹتے ہیں دن اسی کے پہاڑ کٹتے ہیں
طوقِ زنجیر اس کا گہنا ہے میاں مجنوں نے جس کو پہنا ہے
گو کہ گزری نہیں یہ سنتے ہیں اس کے دیوانے تنکے چنتے ہیں
یہ کرشمے انھیں کے سارے ہیں کیسے کیسے جوان مارے ہیں
پاسِ ناموس اس میں جاتا ہے آفت آتی ہے جس پہ آتا ہے
رات کٹنی محال ہوتی ہے زندگی تنگ و بال ہوتی ہے
جگر و دل کا خوں ہوتا ہے رفتہ رفتہ جنون ہوتا ہے

پہلے راتوں کو نیند جاتی ہے
آخرِ کار موت آتی ہے

ناطق

۵۷۔ جوشِ عشق

یعنی میرا اک خستۂ غم تھا ۔ سر تا پا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جا گہ ۔ بے خود ہو گئی جان آگہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت ۔ تاب نے ڈھونڈی یک دم فرصت
سینہ فگاری سامنے آئی ۔ بیتابی نے طاقت پائی
خواب و خورش کچھ کام نہ آیا ۔ ایک گھڑی آرام نہ پایا
آہ سے اس کی مشکل جینا ۔ درد فقط تھا سارا سینا
درد دل سے کچھ نہ کہے وہ ۔ ہر اک کا منہ دیکھ رہے وہ
دل میں تمنّا داغ جگر میں ۔ شیون لب پر یاس نظر میں
آہ و فغاں رہے اس کے لب پر ۔ روز نئی اک آفت سر پر
نالے اس کے شب کو سُن کر ۔ مر گئے کتنے سر کو دُھن کر
نے طاقت نے یارا اس کو ۔ ضعفِ دلی نے مارا اس کو
دست بدل ہر آن رہے وہ ۔ بے طاقت بے جان رہی وہ
رنگ شکستہ بلکہ فسردہ ۔ کہنے کو زندہ لیکن مُردہ

جن نے دیکھا اس کو یک دم اُن نے کہا یہ بھول کر سب غم

چندے یہ ناشاد رہے گا

پر مدت تک یاد رہے گا

میرؔ

۵۸۔ غمِ عشق

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کی یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے جو بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا

نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غالبؔ

۵۹۔ جنونِ عشق

لگے اس پہ جب دن کئی اور بھی ۔۔۔ بگڑنے لگے پھر تو کچھ طور بھی
دیوانی سی ہر طرف پھرنے لگی ۔۔۔ درختوں پہ جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب ۔۔۔ لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
تپِ ہجر گھر دل میں کرنے لگی ۔۔۔ دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی ۔۔۔ بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپِ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ ۔۔۔ اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا ۔۔۔ نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اسے ۔۔۔ محبت میں دن رات گھُٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو ۔۔۔ تو اُٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے ۔۔۔ تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی ۔۔۔ یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے ۔۔۔ کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
کسی نے کہا سیر کیجے ذرا ۔۔۔ کہا سیر سے دل ہے میرا بھرا

جو پانی پلانا تو پینا اسے | غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے
نہ کھانے کی سُدھ اور نہ پینے کا ہوش | بھرا دل میں اس کے محبت کا جوش
چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر | وہی سامنے صورت آٹھوں پہر

نہفتہ اسی سے سوال و جواب
سدا رو بروو اس کے غم کی کتاب

میر حسن

۶۰- دلِ بیقرار کیا ہے

مرے جان نثار کیا ہے، مری غمگسار کیا ہے | تجھے کیوں ہے اتنی اُلجھن، دلِ بیقرار کیا ہے
کوئی پھانس کیا چبھی ہے کوئی چوٹ کیا لگی ہے | کوئی گریہ کا سبب ہے، دلِ اشکبار کیا ہے
نہ یہ کاوشیں ہیں اس میں نہ یہ شورشیں ہیں اس میں | تری جوشِ غم کے آگے غمِ روزگار کیا ہے

تجھے کیوں ہے اس کی خواہش کہ وہ آئیں تیری گھر میں
یہ بتا کسی کے دل پر ترا اختیار کیا ہے

عزیز لکھنوی

۶۱- دلِ بیقرار سو جا

کسی مست ناز کا ہی، عبث انتظار سو جا ‏ ‏ ‏ ‏ کہ گزر گئی شب آدھی، دلِ بیقرار سو جا

ابھی دھان پان ہی تو نہیں عاشقی کے قابل ‏ ‏ ‏ ‏ یہ تپش کا آہ شیوہ، نہ کر اختیار سو جا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم، تجھے گود میں اُٹھا لوں ‏ ‏ ‏ ‏ تجھے سینہ سے لگا لوں، تجھے کر لوں پیار سو جا

یہ تری صدائے نالہ، مجھے متّہم نہ کر دے ‏ ‏ ‏ ‏ مرے پردہ دار سو جا، مرے راز دار سو جا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی، یہ ہوا کے سرد جھونکے ‏ ‏ ‏ ‏ تجھے دے رہے ہیں لوری، مرے غمگسار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہی، شبِ غم بُری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم، دلِ بیقرار سو جا

سرورؔ جہاں آبادی

۶۲- دلِ بیقرار سو جا

نہیں وعدۂ بتاں کا، کوئی اعتبار سو جا ‏ ‏ ‏ ‏ نہ کر انتظار سو جا، دلِ بیقرار سو جا

وہ کریں گے برق و باراں کا بہانہ مجھ سے آکر ‏ ‏ ‏ ‏ نہ ہو بیقرار سو جا، نہ ہو اشکبار سو جا

جو سمجھ ہو تجھ میں ناداں، تو یہ بات خوب سمجھے ‏ ‏ ‏ ‏ کہ جہاں میں عہد خوباں نہیں اُستوار سو جا

تجھے پھینک آؤں گا میں اسی در پہ صبح ہوتے نہ تڑپ کہ رازِ اُلفت نہ ہو آشکار سو جا

پڑی مجھ خواب راحت ہی خدائی دیکھ ساری

مگر اک تجھی یہ ظالم ہے خدا کی مار سو جا

محروم

۶۴- دل کی بیکلی

بیکلی بیخودی کچھ آج نہیں ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن مرضِ عشق کا علاج نہیں

درد اگر یہ ہی تو مجھے بس ہے

اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں

اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں

اُمڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

تیرے بیخود جو ہیں سو کیا چیتیں ایسے ڈوبے کہیں اُچھلتے ہیں

دمِ آخر ہے بیٹھ جا مت جا

صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
وقتِ خوش اُن کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو درد دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں
ایک بیمارِ جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

میر صاحب بھی ترے کوچہ میں شب آتے ہیں
جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات اب یہی روزگار ہے اپنا

دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور
اس میں کیا اختیار ہے اپنا

آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آ جاتا تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا
کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھکو
جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا

میر

۶۴- دل کی بیکلی

مری بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

دمِ رخصت ان کا کہنا کہ یہ کاہے کا ہے رونا
تمھیں میری قسموں کا بھی نہیں اعتبار ہونا

امیر

۶۵- رخصت

وہ رخصت جو اس طرح ہونے لگی
تو وہ صاحبِ خانہ رونے لگی

وہ رد رو کے دو ابرِ غم یوں ملے
کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے

یہاں تک بندھا ان کے رونے کا تار
بہے پھوٹ دیوار و در ایک بار

نہ دیکھا کسی نے جو کچھ اختیار
کہا حق کو سونپا تجھے لے سدھار

چلی جس طرح پیٹھ اپنی دکھا — اسی طرح دکھلا ہمیں منہ پھر آ
کسی نے کہا بھُولیو مت مجھے — خدا کے تئیں میں نے سونپا تجھے
کہا اس نے خیر اب تو جاتی ہوں میں — جو ملتا ہے تو اس کو لاتی ہوں میں

تمھیں بھی خدا کو میں سونپا سُنا
مرا بخشیو تم کہا اور سُنا

میر حسن

۶۶- رخصت

(شیریں آزاد ہو کر رخصت ہو رہی ہے)

گہوارے سے شیریں نے تب اکبر کو اُٹھایا — آنکھوں سے بہت ننھے سے تلوؤں کو لگایا
پھر جھُولے کے اندر یہ دعا دے کے لٹایا — اللہ نبی کا مرے شہزادے پہ سایا

دُنیا کا تجھے سب حشم و جاہ ہو اکبر
اور سونے کے سہرے سے ترا بیاہ ہو اکبر

دبیر

۶۷۔ اضطرابِ رخصت

تھا یہی ذکر جو بجا گھڑیال
سنتے ہی اس کے ہوگئی بدحال

ہوگیا فرطِ غم سے چہرہ زرد
دست و پا تھرتھرا کے ہوگئے سرد

مُردنی رُخ پہ چھا گئی اس کے
دل میں دہشت سما گئی اس کے

دل میں گزرا جو اس کے صبح کا شک
ہوئی استادہ جا کے زیرِ فلک

ٹھنڈی جس دم چلی نسیمِ سحر
ہوگیا حال اور بھی ابتر

اتنے میں صبح کی بجی وردی
دونی چہرہ کی ہوگئی زردی

ہوئے ثابت جو صبح کے آثار
ہوگئی اس کی اور حالتِ زار

بید کی طرح جسم تھرّایا
سر سے لے پاؤں تک عرق آیا

باتیں کرتی جو تھی سو بھول گئی
دم لگا چڑھنے سانس پھول گئی

بولی گھبرا کے رہیو اس کے گواہ

اور کہا لا الٰہ الا اللہ

مرزا شوق

۶۸- جُدائی

یاد آنے لگا وہ جانِ جہاں — گھڑیوں بڑھنے لگا مرا خفقاں
سختیاں ہجر کی نظر آئیں — خالی گھر دیکھا آنکھیں بھر آئیں
دل جو غم سے اُداس ہونے لگا — اختلالِ حواس ہونے لگا
شمع ساں جل گیا کبھی خاموش — روتے روتے کبھی ہوا بیہوش
کبھی دیوانہ وار بکتا تھا — کبھی کچھ مُنہ سے کہہ نہ سکتا تھا
ہوئی فرقت سے میری یہ حالت — نہ وہ رنگت رہی نہ وہ صورت
راحت و عیش سب محال ہوا — دو ہی دن میں عجیب حال ہوا
ہوگئی دل کی ایسی حالتِ زار — جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار
نالہ رُک رُک کے لب پہ آنے لگا — ضعف سے جسم تھرتھرانے لگا
رنجِ فرقت سے غیر حال ہوا — لینا کروٹ تلک محال ہوا
چین دن کو نہ رات کو آرام — یاد میں اس کی صبح سے تا شام
غم سے سینہ پہ مار بیٹھا ہاتھ — اشک بھر لانا بات بات کے ساتھ

دوست جو آتے تھے عیادت کو
روتے تھے دیکھ دیکھ صورت کو

٦٩- گل بکاؤلی

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی خوش اندام

جاگی مرغ سحر کے غل سے — اُٹھی نکہت سی فرش گل سے

مُنہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گُل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل

ہے ہے مرا پھُول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بُو ہو کے تو گل اُڑا نہیں ہے

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چُرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا

گلچیں کا جو ہلے ہاتھ لوٹا — غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل | مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا | خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے | گل تو ہی مہک سنگھا کدھر ہے
لرزاں تھی زبس یہ دیکھ کہرام | تھی سبزہ سی راست مو براندام
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا | جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اس کا غرض لگا بدلنے | گل برگ سی کف لگی وہ ملنے
گل کا سا لہو بھرا گریباں | سبزہ کا سا تار تار داماں
دکھلا کے کہا سمن پری کو | اب چین کہاں بکاؤلی کو
تھی بسکہ غبار سے بھری وہ | آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ | ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ
جس تخت میں مثلِ باد جاتی | اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

نسیم

۷۰- یادِ یار

لگا تھا زبس عشق کا اس کو تیر　　لگی کھینچنے آہ بدرِ منیر
بندھا اس کو عاشق کا اپنے خیال　　لگی رونے آنکھوں پہ دھر کر رومال
کہیں کا کہیں سے اُڑا اس کو راگ　　ہوا سے ہوئی اور گلزار آگ
لگی کہنے یہ ہے میں دیکھوں یہ سیر　　نہو پاس میرے وہ یادش بخیر
وہی جانے ہو جس کے کچھ دل کو لاگ　　کہ معشوق بن سب ہے گلزار آگ
جگر میں اگر آہ کی سول ہو　　لگے خار کیسا ہی گو پھول ہو
درختوں کے عالم سے کیا ہو نہال　　جسے یادِ شمشاد کی ہو کمال
کرے گلشن و گل پہ کیا وہ نظر　　جسے اپنے گل کی نہ ہووے خبر
یہ کہکر اُٹھی واں سے وہ دلربا　　چھپر کھٹ میں جا کر گری منہ چھپا
خوشی کا جو عالم تھا ماتم ہوا　　ورق کا ورق ہی وہ برہم ہوا
سب اُٹھتے ہی بس اس کے جاتی رہیں
طوائف کہیں اور خواصیں کہیں

میر حسن

۱۷۔ ماتمِ ہجر

کروں حالِ ہجراں زدوں کا رقم — کہ گزرا جدائی سے کیا ان پہ غم
کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں — تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہرو — نہ وہ گل ہے اس جا نہ وہ اس کی بو
رہے دیکھ یہ حال حیران کار — کہ یہ کیا ہوا ہائے پروردگار
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی — کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب — کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب

کسی نے دیئے کھول سنبل سے بال
طمانچوں سے جوں گل کئے سرخ گال

سنی شہ نے القصہ جب یہ خبر — گرا خاک پہ کہہ کے ہائے پسر
کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی — کلی کی طرح سے بکس رہ گئی

ہوا گم وہ یوسف پڑی یہ جو دھوم کیا خادمانِ محل نے ہجوم
کہا شہ نے واں کا مجھے دو پتا عزیزو جہاں سے وہ یوسف گیا
گئیں لے وہ شہ کو لبِ بام پر دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیمبر
یہی تھی جگہ وہ جہاں سے گیا کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا
مرے نوجواں میں کدھر جاؤں پیر نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحرِ غم میں ڈبویا مجھے غرض جان سی تو نے کھویا مجھے
کروں اس قیامت کا کیا میں بیاں
ترقی میں ہر دم تھا شور و فغاں

میر حسن

۷۲۔ فراق یار

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کی ان دنوں تو بھی تو اس کو جا کے ستمگار دیکھنا
نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن نے سیر باغ نے گل و گلزار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا
یا جا کے اس گلی کو جہاں تھا ترا گزر لے صبح تا بہ شام کئی بار دیکھنا

تسکینِ دل نہ اس میں بھی پائی تو بہرِ شغل پڑھنا یہ شعر گر کبھی اشعار دیکھنا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجھکو غیر پاس
پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

سودؔا

۴۷- دورِ غم

اسے شاہزادے کا تھا حال یاد جو دیکھا تو یاں اس سے کچھ ہی زیاد
نہ گھر کی وہ رونق نہ اس کا وہ حال گلوں سے لگا دل تلک پائمال
پڑی سارے بید اشت دیوار و در محل کو جو دیکھا تو ٹوٹا سا گھر
خواصیں جو تھیں پاس وہ نازنیں سو میلی کچیلی کہیں کی کہیں
نہ چوٹی گندھی اور نہ کنگھی درست جو چالاک تھی بن گئی وہ بھی سست
ہر اک اپنے عالم میں دیکھو تو رنگ اُڑا رنگ چہرے کا مثلِ پتنگ
نہ آپس کی چہلیں نہ وہ چہچہے نہ گانا بجانا نہ وہ قہقہے
غم آلودہ ہر ایک زار و نزار نہ آرام جی کو نہ دل کو قرار
جو بیٹھیں تو رونا، جو اٹھیں تو غم غرض بیٹھتے اُٹھتے ان پر ستم

حصّہ اوّل

چمن ساری ویران سے ہیں پڑے ... شجرِ گل کے اک جھاڑ سے ہیں کھڑے
جو خود ہے تو حیران و بیمار سی ... کہ جوں زرد شیشے کی ہو آرسی
نہ تاب و تواں اور نہ ہوش و حواس ... ضعیف و نحیف و پریشاں اُداس
یہ دیکھ اس کا احوال نجم النسا
جلی شمع کی طرح آنسو بہا

میر حسن

۴۷۔ خستہ حالی و حسن

ولیکن یہ خوبوں کا دیکھا سبھاؤ ... کہ بگڑی سے دُونا ہوان کا بناؤ
نہیں حسن کی اس طرح بھی کمی ... جو بگڑی ہے بیٹھی تو گویا بنی
غرض بے ادائی ہی یاں کی ادا ... بھلوں کو سبھی کچھ لگے ہی بھلا
جو ماتھے پہ چینِ جبیں غم سے ہی ... تو وہ بھی ہی اک موج دریا ہی مے
وہ آنکھیں جو روتی ہیں بس پھوٹ پھوٹ ... تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ
تپِ غم سی یوں تمتماتے ہیں گال ... کہ جو رنگ لالہ ہو وقتِ زوال
گریباں سینہ پہ جو ہے کھلا ... تو گویا وہ ہے صبحِ عشرت فزا

نقاہت سے چہرہ اگر زرد ہے　　دیا آہ ہونٹوں پہ کچھ سرد ہے

ادا سے نہیں یہ بھی عالم جُدا
کہ ہے چاندنی اور ٹھنڈی ہوا

میر حسن

۷۵۔ شبِ فرقت

یہ شہزادہ جو اس طرح گم ہوا　　تو سارے محل میں تلاطم ہوا
محل میں بپا ایسا ماتم رہا　　کسی میں نہ باقی ذرا دم رہا
یہ نقشہ چمن کا مبدل ہوا　　کہ گلزار جو تھا وہ جنگل ہوا
وہ آتشکدہ سب چمن گل کا تھا　　صدا سوز کی نالہ بلبل کا تھا
شجر جتنے تھے صورتِ غم تھے سب　　جو تھے سرو و نخل ماتم تھے سب
صبا نے چمن میں اُڑائی تھی خاک　　دلِ ملکہ تھا مثلِ گل چاک چاک
ہوا دن تو رونے میں اس کا بسر　　قیامت مگر رات آئی نظر
نہ پہلو میں پایا جو اس یار کو　　ہوا صدمہ اک جانِ بیمار کو
ذرا یاد بھولی نہ اس ماہ کی　　جو کروٹ بھی لی دل سے اک آہ کی

نظر آگیا چاندنی میں جو باغ
ہوا تازہ اس غم سے اک دل پہ داغ

ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی جو چلنے لگی
یہ فرقت کی آتش سے جلنے لگی

سحر تک دل اُس کا بھٹکتا رہا
کہ پہلو میں کانٹا کھٹکتا رہا

تصور جو تھا اس گل اندام کا
کوئی پہلو نکلا نہ آرام کا

تڑپتی تھی یہ رنج جاتا نہ تھا
کسی طرح آرام آتا نہ تھا

مصاحب جو تھی اس کی دخت وزیر
اسے دیکھ کر درد و غم کی اسیر

یہ نقلیں بیاں کرتی تھی برمحل
مگر اس کے دل کو نہ پڑتی تھی کل

خدا کھودے بنیاد اس چاہ کی
جدھر پھر گیا منہ اُدھر آہ کی

کبھی ہوگئے دونوں رخسار زرد
کبھی ہوگئے دست و پا دونوں سرد

کبھی رنگ رخ کے بدلنے لگے
کبھی شعلے منہ سے نکلنے لگے

کبھی ضبط وہ چاہ کرنے لگی
کبھی چیخ کر آہ بھرنے لگی

نہ نیند آئی ہرگز سحر ہوگئی
یہ شب اس کے غم میں بسر ہوگئی

اُڑے آشیانوں سے اپنے پرند
ہوئی بانگ اللہ اکبر بلند

ہوا پھر تو یہ شاہزادی کا حال
کہ گھٹ کر ہو جوں ماہ کامل ہلال

تلاطم میں پھر سب طبیعت رہی
نہ رنگت رہی وہ نہ صورت رہی

بہت آگیا فرق اوقات میں ۔۔۔ وہ کھسیانہ ہو جانا ہر بات میں
وہ گرمی سے رُخ تمتمایا ہوا ۔۔۔ وہ رونے سے منہ بھر بھرایا ہوا
وہ سوجے ہوئے پرنیادار گال ۔۔۔ وہ آنکھوں میں ڈوری پڑے لال لال
غرض کیا بیاں ہو کہ جو حال تھا
جو دیکھے وہ روئے یہ احوال تھا

مرزا شوق

۷۶۔ فرقت کی رات

یہ شبِ فرقت بھی کیسی رات ہے ۔۔۔ ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے
کس قدر تاریک ہے اندھیر ہے ۔۔۔ رات ہے یا پردۂ ظلمات ہے
ہول آتا ہے در و دیوار سے ۔۔۔ ہو نہ ہو یہ لشکرِ آفات ہے
چین اب آتا کسی کروٹ نہیں ۔۔۔ کس مصیبت میں بسر اوقات ہے
درد دل میں اور کلیجے میں جلن ۔۔۔ اور وحشت مجھکو ساری رات ہے
آدھی دنیا سو رہی ہے چین سے ۔۔۔ میرا سینہ مرجع آفات ہے
ہائے بے چینی قلق اور اضطراب ۔۔۔ درد میٹھا میٹھا ساری رات ہے

قل

آہ سینے میں مرے اِک آگ ہے　　نارِ دوزخ جس کے آگے مات ہے

ہائے مایوسی و باقی ہے گلا　　دم نکل جائے تو اچھی بات ہے

میں تو گنتی گنتے گھڑیاں تھک گیا　　کیا قیامت سے بھی لمبی رات ہے

کوئی دیکھے تو گھڑی کیا وقت ہے　　کتنی گزری کتنی باقی رات ہے

ہائے کب اس رات کی ہوگی سحر

یہ عذابِ نزع ہے یا رات ہے

خان احمد حسین خاں صاحب

۷۷۔ آزارِ ہجر

جب سے تم کو لے گیا ہے یہ فلکِ ظالم کہیں　　جی ترستا ہے کہیں اور چشم ہے پُر نم کہیں

ہم پہ جو گزرا ہے وہ گزرا کسی پر کم کہیں　　نے تسلی ہے نہ دل کو چین ہے اک دم کہیں

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں

خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

ہر گھڑی آنسو بہانا دیدۂ خونبار سے　　رات دن سر کو پٹکنا ہر در و دیوار سے

آہ و نالہ کھینچنا ہر دم دلِ بیمار سے　　ہے برا احوال اب تو ہجر کے آزار سے

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

نے کسی سے مہر الفت نے کسی سے پیار ہے　　نے کوئی اپنا رفیق اور نے کوئی غمخوار ہے
دل اِدھر سینے میں تڑپے جی اُدھر بیمار ہے　　کیا کہیں اب تو بہت مٹی ہماری خوار ہے

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

گھر میں جی بہلے نہ باہر انجمن میں دل لگے　　نے خوش آدے سیر نے سیر چمن میں دل لگے
نے پہاڑوں میں نہ صحرا میں نہ بن میں دل لگے　　اب تو تم بن نے گلستاں نے چمن میں دل لگے

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

پر نہیں اُڑ کر تمہارے پاس جو آ جائیے　　جی ہی جی میں کب تلک خونِ جگر کو کھائیے
چشم تر اور داغ سینے کے کسے دکھلائیے　　دل سمجھتا ہی نہیں کیوں کر اسے سمجھائیے

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

نظیر

۷۸۔ لذتِ فراق

وصل کی شب رواں ہیں سوئے فراق | آچلی لو ہوا میں بوئے فراق
اشک بھر لائے وہ بھی وقتِ سحر | جب چلی آہ گفتگوئے فراق
خرمیہائے وصلِ یار کے بعد | اب دکھائی خدا نہ روئے فراق
خود ہیں وہ جانِ آرزوئے وصال | یاد ہے ان کی آبروئے فراق
بہرِ افزایش سرورِ وصال | شوق کو پھر ہے جستجوئے فراق

غلغلِ عہدِ عیش سے حسرتؔ
بڑھ گئے ہیں شور ہائے ہوئے فراق

حسرتؔ موہانی

۷۹۔ انتظارِ یار

بچھا کر وہاں آیا ملکہ کے پاس | تو دیکھا کہ بیٹھی ہے وہ بدحواس
خوشی ہے نہ راحت نہ عیش و طرب | خواصیں بھی میلی کچیلی ہیں سب
کہیں ہے جو مسند تو تکیہ کہیں | کہیں فرش تک بھی بچھایا نہیں

دروں میں ہر اک جا ہیں جالے لگے — چھتوں میں ابابیل کے گھونسلے
نہ بلبل نہ قمری نہ وہ سروِ گل — ہے زاغ و زغن کا خیاباں میں غل
نہ وہ آبپاشی نہ ٹھنڈی زمیں — ہر اک بے قرینے کہیں کا کہیں
نظر جب کہ ملکہ کی اس پر پڑی
تو فرطِ خوشی سے ہوئی اٹھ کھڑی

مرزا شوق

۸۰ - انتظارِ یار

آتشِ عشق جی جلاتی ہے — یہ بلا جان ہی پہ آتی ہے
تو ہے اور سیرِ باغ ہے ہر وقت — داغ ہیں اور میری چھاتی ہے
شام بھی ہو چکی کہیں اب تو — آ شتابی کہ رات جاتی ہے
ٹک خبر لے کہ ہر گھڑی ہم کو — اب جدائی بہت ستاتی ہے
کچھ مناسب نہیں ہے کیا کہیئے
جی میں جو کچھ کہ اپنے آتی ہے

درد

دن تمہارے تو کٹے بارے خوشی سے ہر طرح
ہم بلا سے یاں پڑے، راتوں کو گھبرایا کئے

چین تو ہم کو نہ آیا ایک ساعت اس بغیر
رات دن ہر چند اپنے دل کو سمجھایا کئے

اپنے دروازہ تلک بھی وہ نہ آیا ایک بار
ہر گھڑی اُٹھ اُٹھ کے ہم جس کے لئے جایا کئے

تب ہماری اُسکی اب تک یوں بنی تھی دردؔ یاں
بات ایسی ویسی ہم خاطر میں کم لایا کئے

دردؔ

۱۸۔ انتظار و اضطراب

(شیریں حضرت امام حسین علیہ السلام کے انتظار میں بے چین ہے)

شیریں کو عجب اُلفتِ سلطانِ اُمم تھی ہر دم شہِ والا کی وہ مشتاقِ قدم تھی
آنکھ اس کی سوئے صورتِ بانوئے عجم تھی پتلی صفتِ قبلہ نما سُوئے حرم تھی
غش کرتی تھی اقرارِ امامِ دوجہاں پر
اس کی نہ خبر تھی کہ سر آئے گا سناں پر

ڈیوڑھی پہ سدا نور کے تڑکے اسے آنا اور شام کو دروازے سے روتے ہوئے جانا
گہ صبح سے مولیٰ کے لئے فرش بچھانا اور شام کے نزدیک بصد یاس اُٹھانا
شہ کے لئے تیار کبھی کرتی غذا کو
مولا جو نہ آتے تو کھلا دیتی گدا کو

تقدیر وہاں دربدر آفت کو پھراتی شیریں بیاں در پہ کبھی آتی کبھی جاتی
گھبرا کے کبھی کوٹھے کے نیچے اُتر آتی رہ گیروں کو جا جا کے سرِ راہ سُناتی
دنیا میں ہیں ہوں اور نہیں دنیا کی خبر ہے
لوگو تمہیں کچھ دلبرِ زہرا کی خبر ہے

پائی جو نہ اس نے خبرِ سبطِ پیمبر ذی الحج سے ہوئی تارکِ لذات وہ مضطر
کچھ پی لیا کچھ کھا لیا جو آیا میسر سونے کے لئے فرش و زمیں دونوں برابر
اندیشوں نے یہ حال کو تبدیل کیا تھا
پوشاک بدلنا بھی غرض چھوڑ دیا تھا

ہمسائیاں کہتی تھیں بنایا ہے یہ کیا حال پوشاک جو میلی ہے تو اُلجھے ہوئے ہیں بال
وہ کہتی تھی نیرنگ نظر آتا ہے امسال دریافت مجھی کو نہیں ہوتا مرا احوال
پوشاک کی کچھ مجھ کو خبر ہے نہ ردا کی
اللہ بس اب خیر کرے آلِ عبا کی

۴۸۔ یاروں کا گلا

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار

ربط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم
جانتے ہیں ذات سامی ہی کو ہم سب خاکسار

سو نہ خط ان کا نہ کوئی پرچہ پہنچا مجھ تلک
واہ واہ رے ربط رحمت ہے یہ اخلاص و پیار

لکھتے گر دو حرف لطف آمیز بعد از چند روز
تو بھی ہوتا اس دلِ بیتاب و طاقت کو قرار

خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے
آئیں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار

جب گیا میں یاد سے تب کس کا گھر، کاہے کا پاس
آفریں صد آفریں اے مردمانِ روزگار

میرؔ

۴۳۔ شکوۂ اُلفت

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہو گا   تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہو گا
غم ہجر رکھے گا بیتاب دل کو   ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھ آزار ہو گا
اُٹھیتی ملاقات کب تک رہیگی   کبھو تو تہِ دل سے بھی یار ہو گا
تجھے دیکھکر لگ گیا دل نجانا   کہ اس سنگ دل سے ہمیں پیار ہو گا
یہی ہو گا کیا ہو گا میرؔ ہی نہ ہونگے
جو تو ہو گا بے یار و غمخوار ہو گا

میرؔ

۴۴۔ پیام یار

یہی پیغام دردؔ کا کہنا   گر صبا کوئے یار میں گزرے
کون سی رات آن ملئے گا   دن بہت انتظار میں گزرے

دردؔ

۸۵۔ مہمان داری کا سامان

(شیریں حضرت امام حسین علیہ السّلام کی آمد کی خبر پا کر خوشی خوشی مہمان داری کا سامان کرتی ہے)

یہ کہہ کے اس نے فرش کیا گھر میں سر بسر — مومن کے دل کی طرح مصفّا ہوا وہ گھر
مسند بچھائی بہرِ شہنشاہِ بحر و بر — تکیوں کو صاف کر کے لگایا ادھر اُدھر
کہتی تھی میرے گھر میں ابھی سے جو نور ہے
یہ آمدِ امامِ زمن کا ظہور ہے

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے — یہ نرم فرش ہے علی اکبر کے واسطے
جھولے کی جا یہ ہے علی اصغر کے واسطے — یہ گھر ہے شاہِ دیں کے برادر کے واسطے
راحت سے شہ نشیں پہ امامِ زمن ہیں
حجرہ یہ اس لیے ہے کہ دولہا دلہن ہیں

کرسی کو لا کے جلد کسی جا بچھاتی تھی — تحفوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجدے میں بہرِ شکر کبھی سر جھکاتی تھی — گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی میں آتی تھی
چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بیقرار تھا
فرزندِ فاطمہ کا اسے انتظار تھا

ہمسائیوں سے کہتی تھی ہنس ہنس کے بار بار ۔۔۔ اب کیجیو زیارتِ سلطانِ نامدار
ہے باغ فاطمہ پہ عجب حسن کی بہار ۔۔۔ رشکِ ریاضِ خلد ہے اک ایک گلعذار

سب تو نہالِ گلشنِ دیں لاجواب ہیں
قد سرو باغ حسن ہیں رخ آفتاب ہیں

شمشاد بوستانِ پیمبر کو دیکھیو ۔۔۔ سروِ ریاض حضرتِ شبّر کو دیکھیو
کیا نوجواں ہیں شہ کے برادر کو دیکھیو ۔۔۔ سب ایک سمت تم علی اکبر کو دیکھیو

ہو گا کبھی یہ حسن ملک کا نہ حور کا
جلوہ ہے اس جری میں محمدؐ کے نور کا

خالق رکھے اسے صدوسی سال برقرار ۔۔۔ نامِ خدا ہے شادی کے قابل وہ گلعذار
بہنیں فدا ہیں باپ تصدق ہے ماں نثار ۔۔۔ سر پر پھوپی نے پیار سے گیسو رکھے ہیں چار

چہرے کے آگے نیرِ تاباں بھی ماند ہے
عالم کی روشنی ہے اندھیری کا چاند ہے

اب خیریت سے گزرے گا اٹھارواں جو سال ۔۔۔ شادی کریں گی بیٹے کی بانوئے خوشخصال
زینب کو اس کے بیاہ کا ارمان ہے کمال ۔۔۔ ہر دم یہی دعا ہے کہ دولھا بنے یہ لال

آتی ہیں نسبتیں حلب و شام و روم سے
شادی خدا جو چاہے تو ہو وے گی دھوم سے

مداوّل

جب ڈھل گئی اسے انھیں باتوں میں دوپہر ‏ شوہر سے پھر یہ کہنے لگی وہ نکو سیر
اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہ بحرو بر ‏ اترے کہاں کسی سے مفصل سُنی خبر

بستی سے ساتھ لے کے ہر اک اپنے بھائی کو
جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو

کہیو مری طرف سے یہ تو چوم کر قدم ‏ لونڈی کو سرفراز کرو، یا شہِ امم
کرتے ہیں اغنیا غربا پر سدا کرم ‏ اب بے حضور چین نہیں مجھکو ایک دم

کچھ آج ہے طپش سی دل بیقرار میں
آنکھیں سپید ہوگئی ہیں انتظار میں

قربان ہوگئی مرا گھر کچھ نہیں ہے دُور ‏ خاصہ تناول آن کے اس جا کریں حضور
ہم لوگ مشتِ خاک ہیں حضرت خدا کی نور ‏ ہوگا یہ کو د آپ کے آنے سے رشکِ طور

کہنا حضور راہِ ہدایت کی شمع ہیں
پروانے یاں سحر سے زیارت کو جمع ہیں

عرصہ ابھی ہے آپ کے آنے میں کچھ اگر ‏ آنے میں کیوں حرم کے ہوئی دیر اس قدر
ڈیوڑھی پہ بند و بست ہے یا شاہ بحر و بر ‏ گرد وار کھی ہیں میں نے قناتیں اِدھر اُدھر

محمل میں گھٹتی ہوئیں گی زہرا کی پیاریاں
عباس لے کے آئیں زنانی سواریاں

با نیچے:

۸۶۔ ملاپ

ولیکن محل میں پڑی جب یہ دھوم　　کیا مثل پروانہ اس پہ ہجوم
سنی ایک سے ایک نے یہ خبر　　مبارک سلامت ہوئی یک دگر
کوئی غنچہ کی طرح کھلنے لگی　　کوئی دوڑ کر اس سے ملنے لگی
ٹکے کوئی صدقہ کو لانے لگی　　کوئی سر سے روٹی چھوانے لگی
کوئی آئی باہر سے گھر سے کوئی　　ادھر سے کوئی اور ادھر سے کوئی
حقیقت لگی پوچھنے آ کوئی　　لگی کرنے آپس میں چرچا کوئی
ہوا سر پہ اس کے زبس ازدہام　　لگی کرنے گھبرا کے سب کو سلام

کہا بیبیو کل کہوں گی میں حال
کہ اب راہ کی ماندگی ہے کمال

میر حسن

۸۷۔ وصلِ یار

وصل کی شب میں ہم ہیں جملہ سبانشاط　　دل ہے غرقِ شادمانی جان سیرابِ نشاط

ہے جہانِ آرزو میں آج گویا روزِ عید چل رہی ہے محفلِ دل میں مئے نابِ نشاط
حسرتیں وقفِ طرب ہیں آرزو محوِ سرور بخت نے کھولا ہے رُوئے شوق پر بابِ نشاط
ہیں فراہم اہلِ ذوق آمادہ ہے بزمِ طرب اہتمامِ نغمہ سنجی میں ہیں اربابِ نشاط
ہو گئی جوشِ تمنا سے مبدل بے خودی سازِ حیرت پر لگی جس وقت مضرابِ نشاط
کامیابِ عیش بے حد ہے دلِ عشرت نصیب آرزو کے سر سے گزرا جائے ہے آبِ نشاط
ہے غرض ہر سمت اک ہنگامۂ شادی بپا کچھ نہیں چلتی ملامت گر کی در بابِ نشاط
چل سکے گا اب نہ قابو دل پہ رُعبِ حسن کا یار مجبورِ حیا ہے میں ہوں بیتابِ نشاط
ساز و سامانِ خرد سرمایۂ ہوش و حواس آج لیجائے بہا کر سب کو سیلابِ نشاط
رشک سے بیتاب ہے نیرنگیِ دورِ فلک ہوشیار اے بیخبر اے غافلِ خوابِ نشاط

ہے اسی کا نام حرمانِ اتم اے وصلِ یار
خاطرِ محروم حسرت کو نہیں تابِ نشاط

حسرت

۸۸- تولدِ پسر

سب ناری آئیں گونے کی، اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں
کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں، کچھ گیت جچا کے گاتی تھیں

کچھ ہر دم مکھ اس بالک کا، بلہاری ہو کر دیکھ رہیں
کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں، کچھ سونٹھ سنوارا کرتی تھیں

کچھ کہتی تھیں "ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو"
کچھ کہتیں "ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو"

کوئی گھٹّی بیٹھی گرم کرے، کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی
کوئی لائی ہنسلی اور کھڑوے، کوئی کُرتہ ٹوپی میوہ گھی

کوئی دیکھے روپ اس بالک کا، کوئی ماتھا چومے مہر بھری
کوئی بھنووں کی تعریف کری، کوئی آنکھوں کی کوئی پلکوں کی

کوئی کہتی "عمر بڑی ہووے اے بیر تمہارے بالے کی"
کوئی کہتی "بیاہ بہو لاؤ، اس آس مُرادوں والے کی"

نظیر اکبرآبادی

۸۹۔ راحتِ پسر

نعمت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر   راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر   نکہت کوئی بوئے گلِ تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی رُوح یہی روح یہی ہے

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے وہ گل ہے کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے آبادیِ کاشانۂ انساں ہے اسی سے

کس طرح سے کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ وہ ہے عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے یہ وہ ہے نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پرنور مکاں رہتا ہے جس سے وہ دُر ہے قوی رشتہ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لُٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

دنیا میں بس اک مرجع آمال یہی ہے ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے

دلبند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسایش و راحت ہے پسر سے تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے

خون جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے　　ایامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے
آرامِ جگر قوتِ دل راحتِ جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے خوشی در پہ کھڑی رہتی ہے جس سے　　وہ چین ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ لعل ہے اُمید بڑھی رہتی ہے جس سے　　وہ دُر ہے یہ دُر جان لڑی رہتی ہے جس سے
آرام جگر تاب و تواں ساتھ ہے اس کے
پھرتا ہے جدھر راحتِ جاں ساتھ ہے اس کے

مالک سے بھرے گھر کے اُجڑ جانے کو پوچھو　　گھر والوں سے اس تفرقہ پڑ جانے کو پوچھو
ماں باپ سے قسمت کے بگڑ جانے کو پوچھو　　یعقوب سے یوسف کے بچھڑ جانے کو پوچھو
اللہ دکھائے نہ الم نورِ نظر کا
بہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب و جگر کا

انیسؔ

۹۰۔ ماں کی ممتا

ممتا ماں کی جانتے ہیں سب　　ماں ہے بچّہ کی پرورش کا سبب

بھوک بچّے کو ہی ستاتی جب ماں سے کرتا ہے رو کے دودھ طلب
دودھ دیتی ہے پیار کرتی ہے جان اُس پر نثار کرتی ہے
بچّہ سینے سے جو رہا ہے چمٹ نہیں لے سکتی بے دھڑک کروٹ
پاؤں کی بھی نہ ہو ذرا آہٹ کبھی ننھے کی جائے نیند اُچٹ
اُوں اُوں کرتی تھپکتی جاتی ہے ہولے ہولے سرکتی جاتی ہے
جب گیا وہ ننھا بچہ پڑ سو چھوٹے تکیے لگا دیئے دو دو
کیے سب کام تھے ضروری جو پر نہیں بھولتی ہے بچّہ کو
لیتی رہتی ہے ماں خبر ہر دم اپنے بچہ پہ ہے نظر ہر دم
ماں کو آرام کی کہاں فرصت سوئی بیڈھب تو آگئی شامت
کپڑے لتّوں کی ہوگئی کیا گت ہے بچھونا بھی تربہ ترلت پت
صبح اُٹھکر کھنگالتی ہے تمام جاڑے پالے کا وقت اور یہ کام
بچّہ اتنے میں چونک اُٹھا سوکے ناک میں دم کیا ہے رو رو کے
ماں نے پھر لے لیا ہے خوش ہوکے نیا کُرتہ بدل کے مُنہ دھو کے
دیکھکر اس کا چاند سا مکھڑا بھول جاتی ہے اپنا سب دکھڑا
باتیں کرتی ہے پیار سے جوں جوں بولتا ہے جواب میں آغوں

رات کو لوریاں سُناتی ہے — گود میں لے کے بیٹھ جاتی ہے
کس قدر زحمتیں اُٹھاتی ہے — بچّہ ہے اور ماں کی چھاتی ہے
جب لگایا ہے آنکھ میں کاجل — پڑا بچّہ کی تیوری میں بل
دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈالیں مل — بچّہ بےچین ہے تو ماں بےکل
کبھی کنڈی بجا کے بہلایا — کبھی کندھے لگا کے بہلایا
چپ کیا جھنجھنا بجا کے اسے — سوئی خود پیشتر سُلا کے اسے
اس کا ہے پیٹ جو دُبلا پکاتی ہے — اُنگلیوں سے اسے چٹاتی ہے
باتیں کرنا اسے بتاتی ہے — پاؤں چلنا اسے سکھاتی ہے
ہر طرح پر سنبھالتی ہے اسے — اللہ آمین سے پالتی ہے اسے

ماں کو بچّہ سے جو محبت ہے
درحقیقت خدا کی رحمت ہے

اسمٰعیل

۹۱۔ ماں کا پیار

کیسا لیٹا ہے یہ خوش و خرم — نہ کوئی فکر ہے نہ کوئی غم

نہ تو روتا نہ بلبلاتا ہے — گود میں کیا ہمک کے آتا ہے
مسکراتا ہے کیا ہی خوش ہو کر — جیسے چڑیا مگن ہو ڈالی پر
جب کہ سونے کا وقت ہے آتا — مرے سینہ سے ہے چمٹ جاتا
جب کہ آنکھوں میں نیند آتی ہے — بستر اس کا میری چھاتی ہے
نیند لے کر ہنسی خوشی سے اُٹھا — پھول گویا کھلا چنبیلی کا
لگ گئی بھوک کہہ نہیں سکتا — پیاری نظروں سے ہے مجھے تکتا

پیار کا بھی مرے یہی ہے سبب
نہیں آتا بیان میں مطلب

اسمٰعیل

۹۲۔ طفلِ شیر خورے

کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دودھ کے چٹورے — ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے
پاؤں میں کالے ٹیکے ہاتھوں میں نیلی ڈورے — یا چاند سی ہو صورت یا سانولے و گورے

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

گُل کی طرح سے ہر دم سینے پہ پھولتے ہیں — پی پی کر دودھ ماں کا خوش ہو کے پھولتے ہیں

ماں باپ ان کی خدمت سر پر قبولتے ہیں ہاتھوں میں کھیلتے ہیں جھولوں میں جھولتے ہیں
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

جو دیکھے ان کی صورت لے پیار سے کھلائے ہاتھوں اوپر اچھالے اور چھیڑ کر ہنسائے
چومے کبھی دہن کو چھاتی کبھی لگائے کوئی چپی منہ میں دیدے کوئی جھنجھنا بجائے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

چھوٹا سا کوئی کرتا ان کا نکالتا ہے یا چھوٹی چھوٹی ٹوپی سر پر سنبھالتا ہے
ماں دودھ ہے پلاتی اور باپ پالتا ہے نانا گلے لگاوے دادا اچھالتا ہے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

نظیر اکبر آبادی

۹۳۔ معصوم بھولے بھالے

کیا دن تھے یار وہ بھی تھے جب کہ بھولے بھالے نکلے تھی دائی لے کر پھرتے کبھی ددا لے
چوٹی کوئی رکھالے بدھی کوئی پنھالے ہنسلی گلے میں ڈالے منت کوئی بڑھالے
موٹے ہوں یا کہ دبلے گورے ہوں یا کہ کالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم نے حیا ہے — آگا بھی کھل رہا ہے پیچھا بھی کھل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے ننگے پھرے تو کیا ہے — یاں یوں بھی واہ وا ہے اور ووں بھی واہ وا ہے

کچھ کھالے اس طرح سے کچھ اس طرح سے کھالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

مر جائے کوئی تو بھی کچھ ان کو غم نہ کرنا — نے جانیں کچھ بگڑنا نے جانیں کچھ سنورنا
ان کی بلا سے گھر میں ہو قند یا شکر نا — جس بات پر یہ مچلے بس وہ ہی کر گزرنا

ماں اوڑھنی کو باوا پگڑی کو بیچ ڈالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جو ان کو دو سو کھالیں پھیکا ہو یا سلونا — ہیں بادشہ سے بڑھکر جب مل گیا کھلونا
جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہی ان کو سونا — پروا نہ کچھ پلنگ کی نے چاہیئے بچھونا

بھونپو کوئی بجالے پھرکی کوئی پھرالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

یہ بالے پن کا یارو عالم عجب بنا ہے — یہ عمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشہ ہے
اور سچ اگر جو پوچھو تو بادشہ بھی کیا ہے — اب تو نظیرؔ میری سب کو یہی دعا ہے

جیتے رہیں سبھی کے آس و مراد والے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

(نظیر اکبر آبادی)

۹۴- مسرّتِ طفلی

پنگوڑے میں تھا ایک نادان بچا پڑا چوستا تھا وہ اپنا انگوٹھا
نہ دیکھا تھا مُنہ اس نے رنج والم کا میں سمجھا یہی ہے مسرت کا پُتلا
میسّر ہے اس کو خوشی دو جہاں کی
نہ ڈر باپ کا ہے نہ دہشت ہے ماں کی

نہ کچھ طلب و یاس کی اس کو خبر ہے ہوائے زمانہ نہ یہاں بے اثر ہے
نہ کچھ دل میں نیکی بدی کا گزر ہے نہ کچھ دوستی دشمنی پر نظر ہے
نہ شادی ہے پوری نہ ماتم ہے پورا
ابھی مُسکرایا ابھی مُنہ بسورا

نہ خواہش ہے کوئی نہ تدبیر کوئی نہ کچھ معذرت ہے نہ تقصیر کوئی
نہ کچھ جرم ہے اور نہ تعزیر کوئی کوئی خواب ہے اور نہ تعبیر کوئی
نہ اپنا پرایا نہ میرا نہ تیرا
میں سمجھا یہی ہے مسرت کا ڈیرا

مگر دو قدم آگے چل کر جو دیکھا تو آیا نظر دوسرا ایک لڑکا

گلی میں وہی کودتا پھر رہا تھا — مگر کھیل میں تھا وہ مشغول ایسا
کہ تھا بے خبر شام ہے یا سحر ہے
بلا جانے اس کی کہ دُنیا کدھر ہے

محبت سے جس وقت ماں نے بلایا — تو مُرشد نے باتوں میں اس کو اُڑایا
فغاں وہ ہوئی ناز اس نے دکھایا — مچل کر کہا تم چلو میں بھی آیا
اِدھر سے ہوئیں دھمکیاں میٹھی میٹھی
اُدھر سے ہوئیں شوخیاں میٹھی میٹھی

نہ کچھ بھوک ہے اور نہ کچھ پیاس اس کو — نہ اُمید ہے اور نہ کچھ یاس اس کو
نہ کچھ ماں سے وعدہ کا ہے پاس اس کو — نہ کچھ وقت کا بھی ہے وسواس اس کو
یہاں تک کہ سب غم غلط کھیل میں ہے
میں سمجھا مسرّت فقط کھیل میں ہے

بیتاب

۹۵ - بچہّ اور ہلال

رنگیں ادائیں دونوں رنگیں جمال دونوں — نورس ثمر ہیں دونوں اور نونہال دونوں

بچّے ابھی اگرچہ ہیں خورد سال دونوں — بڑھکر کریں گے اک دن کسبِ کمال دونوں

آ مل کے ساتھ کھیلیں ہم تم ہلال دونوں

چھوٹی سی کیا ہی دلکش ہے یہ کمان تیری — مجھکو پسند دل سے ہے آن بان تیری

پر یہ نہیں رہیگی بچپن کی شان تیری — دو چار دن کی طفلی ہے میہمان تیری

آ مل کے ساتھ کھیلیں ہم تم ہلال دونوں

تو بڑھ کے بدر ہوگا جس طرح آسماں پر — ڈالے گا اپنی کرنیں اس تیرہ خاکداں پر

میرا شباب یوں ہی آئیگا عنفواں پر — شفقت کا نور میں بھی برساؤں گا جہاں پر

آ مل کے ساتھ کھیلیں ہم تم ہلال دونوں

ننھے سے او کھلاڑی او آسماں کے ساکن — آ کھیل لیں کہ دونوں بچے ابھی ہیں کمسن

دو چار دن کے مہماں ہیں کھیل کود کے دن — پیری میں ولولے ہیں طفلی کے غیر ممکن

آ مل کے ساتھ کھیلیں ہم تم ہلال دونوں

کشتی اتار لاہاں چھوٹی سی آسماں سے — ایسا کہاں کا اونچا ہے تو مرے مکاں سے

ہوں تیر چھوڑنے کو مضطر تری کماں سے — تیرے لئے تڑپتا ہوں میں غمِ نہاں سے

آ مل کے ساتھ کھیلیں ہم تم ہلال دونوں

یارب نہ چشمِ بد سے پہنچے گزند تجھکو — ہو شام کی سیاہی دود سپند تجھکو

ہاں کون سے کھلونے ہیں دل پسند تجھکو
گردوں کرے بڑھا کر بالا بلند تجھکو
آ مل کے ساتھ کھیلیں ہم تم ہلال دونوں

سرود

۹۶۔ ہندوستان کی ایک حسین لڑکی اور اس کی ہنسی

دل کو لبھا رہا ہے انداز اس ہنسی کا
پیش نظر ہی نقشہ کھلتی ہوئی کلی کا

یہ دانت صاف اس کے یہ ہونٹ لال اس کے
دو نیم رنگ گل ہیں چہرے میں گال اس کے

قدرت نے ان لبوں کو کیا لال کر دیا ہی
دو حرف لکھ کے گویا شنجرف بھر دیا ہی

اپنی ہنسی کی شاید اس کو خبر نہیں ہی
کیا پھول کھل رہے ہیں اس پر نظر نہیں ہی

گالوں میں پڑ گئی ہی کچھ کچھ شکن ہنسی سے
چمکا ہی حسن فطرت اس حسن عارضی سے

چشمے میں منہ کو دھونا اور بار بار ہنسنا
کیا لطف دے رہا ہی بے اختیار ہنسنا

پانی میں دیکھتی ہے رخ اپنا پیارا پیارا
خوش کر رہا ہی شاید اس کو وہی نظارہ

جنبش میں عکس رخ کو ہنس ہنس کے دیکھتی ہے
لہروں سے کھیلنے کا شاید سبب یہی ہے

مچھلی پکڑ رہی ہی چلو میں دل لگی سے
ملتی نہیں وہ اس کو ہنستی ہی یہ اسی سے

آئینہ ہی نہ اس دم پاس اس کے آرسی ہے
دانتوں کو مانجھ کر یہ پانی میں دیکھتی ہے

پانی میں صورت اپنی اس نے جو دیکھ پائی
سمجھی کہ اور کوئی اس کے مقابل آئی

واقف نہیں کہ ہے یہ اپنا ہی عکس پیدا
یہ راز ہو نہ یارب اس پر کبھی ہویدا

سمجھے گی عکس اپنا تو جھینپ جائے گی یہ
ہنس ہنس کے بھولے پن سے کیوں منہ چڑائے گی یہ

کانوں میں سبز بندے کیا لطف دے رہے ہیں
ہل ہل کے خوب بوسے گالوں کے لے رہے ہیں

ہلنے سے ان کے شاید کچھ لطف آرہا ہو
بندوں کا گدگدانا اس کو ہنسا رہا ہو

چھوٹی سی شاخِ گل کو کرتے میں رکھ لیا ہے
کانٹے نے چبھ کے شاید اس کو ہنسا دیا ہے

پیڑوں کو دیکھ کر یہ ہنستی ہے کس ادا سے
خوش کر رہی ہیں چڑیاں آواز نغمہ زا سے

پانی میں گر پڑی یہ پھر بھی ہنسی نہ چھوڑی
اُٹھتے ہی پھول اُٹھایا اور اوڑھنی نچوڑی

نازک ہیں ہاتھ اس کے پانی نچڑ سکے کیا
کاش اوڑھنی یہ دیتی اور میں نچوڑ دیتا

جھٹکا رہی ہے دیکھو ہنس ہنس کے بال اپنے
آنچل سے پونچھتی ہے ہر بار گال اپنے

کیا کھلکھلا رہی ہے اس کی ہنسی تو دیکھو
رُخ پر لٹیں پڑی ہیں وارستگی تو دیکھو

ظاہر ہے بھولے پن سے قدرت کی کارسازی
خوبی کو ناز اس پر خود اس کو بے نیازی

چھیڑوں میں اس کو لیکن جھینپے تو منہ چڑائے
چل دے تو لطف میرا حسرت کا داغ کھائے

غم سے کبھی نہ یارب اس کی ہنسی ہو زائل
رکھے لڑکپن اس کا اس کو ہنسی پہ مائل

کیا چیز ہے لڑکپن پروا نہیں کسی کی
اے شوق عمر طفلی ہے جان زندگی کی

۹۷- سحرِ موسیقی

یہ چھاؤں تاروں کی کم کم یہ نور کا تڑکا — گلوں پہ شبنمِ تر کے یہ گوہرِ شہوار
یہ جوش لالۂ صحرا یہ سبزۂ کہسار — یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا یہ نسیمِ عنبر بار
یہ شاخ شاخ پہ اندازِ زمزمہ خوانی — یہ طائرانِ ترنم سرائے فصلِ بہار
فضائے عرش میں نغمہ طرازی کی قدرت — ہوا کے پردوں میں بانگِ سرودِ موسیقار
یہ دلفریبیٔ دریا کا دل ربا منظر — دمِ خرام یہ موجوں کی شوخیٔ رفتار

روان ہے ہلکی سی اک سطحِ آب پر کشتی
اور اس میں ایک حسینہ بجا رہی ہے ستار

جبیں ہے چاند سی زلفِ سیاہ بھونرا سی — کنول سے پائے نگاریں ہیں پھول سے رخسار
لباس حسن ہے تصویرِ پاک دامانی — ہے ساری ہلکی سی ریشم کی ایک زیب کنار
غرض کہ حسن کی ہے سر سے پاؤں تک مورت — نظر فریب ادا۔ دلفریب نقش و نگار

سہیلی سامنے بیٹھی ہے اک سمن اندام
کہ جس کے باغِ جوانی میں ہے شروعِ بہار

عجیب دُھن سی ہے چھیڑا ترانۂ شیریں — کہ جھومتے لبِ ساحل ہیں وجد میں اشجار

فسونِ نغمہ میں دل کش سکوں کچھ ایسا ہے
ٹھہر ٹھہر کے ہے چلتی صبا دمِ رفتار
گداز شوق کا عالم ہے قلب دریا میں
ہر ایک موج میں ہے اضطراب نبضِ شرار
قریب ہو کے گزرتی ہے جوشِ مستی میں
عجیب لغزشِ مستانہ سے نسیم بہار
نہیں ہے اب لبِ قمری پہ نالۂ کوکو
شرابِ ذوقِ ترنّم سے ایسی ہے سرشار
صدائے نغمہ نے افسوں کچھ ایسا پھونکا ہے
کہ ہے سکوت میں مرغانِ شکّریں منقار
غرض کہ طرفہ ہے جادو فسونِ موسیقی
بشر تو کیا کہ بہائم کو کرتا ہے یہ شکار

شاکر

۹۸ - جوگن کی بین

جہاں بیٹھ کر وہ بجاتی تھی بین
تو سننے کو آتے تھے آہوئے چین
بجاتی وہ جوگن جہاں جوگیا
وہاں بیٹھتی خلق دھونی لگا
اسے سن کر آتا تھا صحرا کو جوش
صدا سے درختوں کو آتا خروش
گُلِ نغمہ اس سے جو گرتے ہزار
تو لیتا انھیں دشت دامن پسار
کہیں حلقہ حلقہ کہیں لخت لخت
کھڑے ہو کے گرد اس کے سنتے درخت

بجاتی تھی جوں جوں وہ بن بن کے بین — خس و خار سنتے تھے بن بن کے بین
نظر جو کہ پڑتی تھی بوٹی جڑی — ہر اک عالمِ شوق میں تھی کھڑی
تماشا نہ دیکھا تھا جو یہ کبھی — دد و دشت غش ہو پڑے تھے سبھی
نہ پانی ہی سن شور اس کا چلے — کنویں کے بھی دل میں اُٹھے ولولے
نہ چشمے ہی کچھ آبدیدہ رہے — گریبان کر چاک دریا بہے
ہوا بلبل و گل کا یاں تک ہجوم — کہ گرتی تھیں واں ڈالیاں جھوم جھوم
تحیّر کا تھا واں ہر اک کو مقام — زباں کا نکلتا تھا ہاتھوں سے کام
یہ ہر جا پہ تھا اس کے دم سے طلسم — بندھا تھا اسی دم قدم سے طلسم

شب و روز سرگشتہ مثلِ صبا
اسی طرح پھرتی تھی وہ جابجا

قضارا سہانا سا اک دشت تھا — کہ یک شب ہوا اس کا واں بسترا
وہ تھی اتفاقاً شبِ چاردہ — ادا سے وہ بیٹھی وہاں رشکِ مہ
بچھی ہر طرف چادرِ نور تھی — یہی چاندنی اس کو منظور تھی
بچھا مرگ چھالے کو اور لیکے بین — دو زانوں سنبھل کر وہ زہرا جبین
کدارا بجانے لگی شوق میں — لگی دست و پا مارنے ذوق میں

کدارا یہ بجنے لگا اس کے ہاتھ — کہ مینہ نے کیا دائرہ لے کے ساتھ
بندھا اس جگہ اس طرح کا سماں — صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں
وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر — وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اُجلا سا میدان چمکتی سی ریت — اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتّے چمکتے ہوئے — خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سایہ سے مینہ کا ظہور — گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور
گیا ہاتھ سے بین سُن کر جو دل — گئے سایہ و نور آپس میں مل
ہوا بندھ گئی اس گھڑی اس اصول — بسیرا گئے جانور اپنا بھول
درختوں سے لگ لگ کے بادِ صبا — لگی وجد میں بولنے واہ وا

کدارے کا عالم یہ تھا اس گھڑی
کہ تھی چاندنی ہر طرف غش پڑی

میر حسن

۹۹- بانسری کی کوک

لعلِ معجز نما سے بنسی — اے لو، وہ شام سے لگادی

پیدا ہوا اک نفس سے اعجاز — اب اس سے زیادہ کون ساساز
ہر ایک ترانہ دل ربا ہے — جنگل نغموں سے گونج اٹھا ہے
عالم طاری ہی بیخودی کا — نغمہ ساری ہی بانسری کا
طائر اشجار پر ہیں خاموش — محو لذات جنتِ گوش
مرغ تصویر ہر پرندہ — پابا زنجیر ہر چرندہ
سکتے میں کھڑے ہوئے ہیں آہو — گویا کوئی کر گیا ہے جادو
دم ناچنے کو ہوئی چنو رہے — پر اپنے سے مور بیخبر ہے
اک جذبۂ بیخودی میں آکے — لہراتے ہیں سانپ پھن اُٹھاکے
جنگل کی ہر ایک بھینس گائے — سکتہ میں ہی اپنا منہ اُٹھائے

جب وحشیوں کا ہوا ہی یہ طور
حالت انساں کی کیوں نہ ہو اور

گاؤں سارا گوالیوں کا — ہی محو سکوت اب پچھڑا ایسا
گویا آبادہی نہیں ہے — خالی انسان سے زمیں ہے
بیکار ہیں جو ابھی ستھے مشغول — کس شغل میں تھی گئے یہ سب بھول
کھیتوں میں جو ہل چلا رہے تھے — اور ساتھ ہی گنگنا رہے تھے

چپ چاپ وہ اب کھڑی ہوئے ہیں — گویا کہ وہیں گڑے ہوئے ہیں
بچے گلیوں میں گھر کے اندر — ہیں ناچتے بانسری کی لے پر
سب عورتیں مائیں بیویاں سب — خاموش ہیں تھیں جہاں جہاں سب
ڈالا ہے وہ زیر و بم نے پھندا — چھوٹے بیٹھی ہیں گھر کا دھندا
جو بن جن پر شباب کا ہے — یہ نغمہ انھیں تو فتنہ زا ہے
دل کو ہے یہ بیقرار کرتا — آنکھوں کو ہے اشکبار کرتا
تھامے ہوئے ہیں جگر کو دل کو — سنتی ہیں نوائے متصل کو
جو واقفِ رازِ معرفت ہیں — شنوندۂ سازِ معرفت ہیں

یہ ہنسی انھیں بھی ہے رلاتی
پیغام ہے دوست کا سناتی

محروم

۱۰۰۔ محفلِ رقص و سرود

ہوا حکم گوری کا جو برملا — لئے ساز اپنے سبھوں نے اٹھا
دیا آسماں پر جو طبلوں کو کھینچ — ہر اک تھاپ میں دل لیا سب کا اینچ

لگی گانے ٹھپّہ وہ اس آن سے — نکلنے لگی جان ہر تان سے
عجب تان پڑتی تھی انداز سے — کہ بیکل تھی ہر تان آواز سے
غرض کیا کہوں اس کا میں ماجرا — عجب طرح کی بندھ گئی تھی ہوا
وہ گانے کا عالم وہ حسنِ بیاں — وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں
گھڑی چار دن باقی اس وقت تھا — سہانا ہر اک طرف سایہ ڈھلا
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ — وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
گلابی سا ہو جانا دیوار و در — درختوں سے آنا شفق کا نظر
وہ سرو سہی اور آبِ رواں — وہ مستی سے پانی کا بہنا وہاں
وہ اڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا — کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ
وہ رقص بتاں اور ستھرا الاپ — وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ
وہ دل پینا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ — اچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ
نہ انسان ہی کا ہو دل اس میں بند — ہوئے محو سن کر چرند اور پرند
غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے — اڑے جس جگہ کو اڑے رہ گئے
جو بیٹھے تھے آگے نہ وہ چل سکے — جو بیٹھے سو بیٹھے نہ پھر ہل سکے
لگی دیکھنے آنکھ نرگس اٹھا — گلوں نے دیئے کان اودھر لگا

لگے ہلنے آ وجد میں سب درخت — کھڑے رہ گئے سرو ہو کر کرخت
درختوں سے گرنے لگے جانور — بنے مثلِ آئینہ دیوار و در
بندھا اس طرح کا جو اس جا سماں — ہوا سب کے دل کا عجب حال واں
عجب راگ کو بھی دیا ہے اثر
کہ ہو جائے پتھر کا پانی جگر

میر حسن

باب ختم بنہایت

جذباتِ فطرت

ضمیمہ

شعرا اور اُن کا کلام

استدعا۔ ذیل میں شعرا کے متعلق جو جو حالات دریافت طلب ہیں اگر کوئی صاحب اُن سے مطلع فرمائیں گے تو باعث مشکوری ہوگا اُمید کہ طبع ثانی میں کل حالات مکمل ہوجائیں گے

صفحہ

۱۔ آتش خواجہ حیدر علی صاحب مرحوم

ولادت وطن لکھنؤ وفات سنہ ۱۲۶۳ھ مدفن لکھنؤ

۲۔ اسمٰعیل مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم

ولادت سنہ ۱۸۴۴ء وطن میرٹھ وفات سنہ ۱۹۱۷ء مدفن میرٹھ

صفحہ

صفحہ

۶ - امیرؔ منشی امیر احمد مینائی صاحب مرحوم

ولادت ۱۲۴۴ھ وطن لکھنؤ وفات ۱۳۱۹ھ مدفن حیدرآباد

۷ - انشاؔ انشاء اللہ خان صاحب مرحوم

ولادت وطن دلّی وفات ۱۲۳۳ھ مدفن لکھنؤ

۸ - انیسؔ میر ببر علی صاحب مرحوم

ولادت ۱۲۱۶ھ وطن دلّی وفات ۱۲۹۱ھ مدفن لکھنؤ

صفحہ

صفحہ

۲۲- سودا مرزا رفیع صاحب مرحوم

ولادت ۱۱۲۵ھ وطن دلی وفات ۱۱۹۵ھ مدفن لکھنو

۲۳- شاکر منشی پیارے لال صاحب

ولادت وطن میرٹھ

۲۴- شوق قدوائی مولوی احمد علی صاحب

ولادت وطن

۲۵- طالب منشی ونایک پرشاد صاحب

ولادت وطن بنارس

۲۶- ظفر سراج الدین بہادر شاہ رحمۃ اللہ علیہ

ولادت وطن دلی وفات مدفن رنگون

۲۷- عزیز مرزا محمد ہادی صاحب

ولادت وطن لکھنؤ

۲۸- عزیز عزیز الرحمٰن صاحب

ولادت وطن بلگرام

۲۹- غالب مرزا اسد اللہ خاں صاحب مرحوم

ولادت ۱۷۹۶ء وطن دلّی وفات ۱۸۶۹ء مدفن دلی

۳۰- محروم منشی تلوک چند صاحب

ولادت وطن

۳۱- مرزا شوق نواب مرزا شوق صاحب مرحوم

ولادت وطن وفات مدفن

۳۲۔ مسلم محمد مسلم صاحب

ولادت وطن عظیم آباد

۳۳۔ مصحفی شیخ غلام ہمدانی صاحب مرحوم

ولادت وطن امروہہ وفات مدفن لکھنؤ

۳۴۔ مومن مومن خاں صاحب مرحوم

صفحہ

ولادت وطن دلی وفات ۱۲۶۸ھ مدفن دلی

۳۵ - میر میر تقی صاحب مرحوم

ولادت ۱۱۲۵ھ وطن اکبر آباد وفات ۱۲۲۵ء مدفن لکھنؤ

۳۶ - میر حسن میر غلام حسن صاحب مرحوم

ولادت وطن دلی وفات مدفن لکھنؤ

۳۷ - ناظر چودہری خوشی محمد صاحب

ولادت وطن

۳۸ - نجم گیلانی سید نجم الہدیٰ صاحب

ولادت وطن

۳۹ - تسلیم پنڈت دیاشنکر صاحب آنجہانی

ولادت وطن لکھنؤ وفات

صفحہ

۴۰ - طباطبائی مولوی علی حیدر صاحب حیدر یار جنگ

ولادت وطن لکھنؤ

۴۱ - نظیر شیخ ولی محمد صاحب مرحوم

ولادت وطن اکبر آباد وفات مدفن

صفحہ

۴۲ ۴۲

محمد الیاس برنی صاحب کی کتابیں

معاشیات

(۱) علم المعیشت۔ اکنامکس (Economics) پر اُردو میں یہ سب سے پہلی نہایت مستند اور جامع کتاب ہے۔ مشکل سے مشکل معاشی اُصول کو ایسے سلیس اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے مضامین بخوبی ذہن نشین ہونے کے علاوہ خاصی تفریح حاصل ہوتی ہے۔ خوبی مضامین کی بدولت ہندوستان کے ہر حصہ میں یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہے۔ لطف یہ کہ یونیورسٹیوں میں اکنامکس کے متعلم بیسیوں ضخیم انگریزی کتابوں کو چھوڑ کر اس کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اقبال (جو خود معاشیات کے بڑے عالم ہیں) تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کی کتاب علم المعیشت اُردو زبان پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اکنامکس پر اُردو میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے اور ہر لحاظ سے مکمل"۔ ضخامت تقریباً ۸۰۰ صفحہ۔ خوشنما جلد۔ بسلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو شایع ہوئی ہے قیمت - - - - - - - - - - - - للعہ

(۲) **معیشت الہند** - ہندوستان کے گوناگوں معاشی حالات جن کا جاننا ملک کی اصلاح و ترقی کے واسطے ازحد ضروری ہے، کافی تحقیق اور تنقید کے بعد بہت سلیس اور دلچسپ طرز پر علمی پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ بھی اُردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ علم المعیشت میں معاشیات کے جو اُصول و مسائل بیان ہوئے ہیں، اس کتاب کے ذریعہ سے اِن کا ہندوستان میں عمل درآمد دکھایا گیا ہے یہ دونوں کتابیں جامعہ عثمانیہ کی بی اے کلاس کے نصاب میں داخل ہیں۔ ضخامت تخمیناً ۷۰۰ صفحہ۔ خوشنما جلد۔ منجانب جامعہ عثمانیہ شایع ہو گی۔ تیار ہو رہی ہے۔

(۳) **مالیات** - پبلک فنانس (Public Finance) پر اُردو زبان میں یہی سب سے پہلی مستند اور جامع کتاب ہے مہذب اور ترقی یافتہ سلطنتوں کے ہاں آمدنی کے کیا کیا ذرایع اور خرچ کی کیا کیا مدیں ہیں اور محاصل و مصارف کا انتظام کس نہج پر قایم ہے۔ سلطنتوں کی مالی ترقی اور مرفہ الحالی کے کیا اسباب ہیں اور اُن کا کیونکر عملدرآمد ہوتا ہے یہ تمام دقیق اور اہم مباحث نہایت سلیس اور دلچسپ طرز پر علمی پیرایہ میں پیش کئے ہیں۔ ہندوستان کے قومی رہبروں اور رئیسوں کو اِس کتاب کا مطالعہ بہت مفید بلکہ ازحد ضروری ہے۔ ضخامت تخمیناً ۵۰۰ صفحہ۔ خوشنما جلد (زیر تالیف)

(۴) **مقدمۃ المعاشیات۔** مورلینڈ صاحب کی انگریزی کتاب انٹرڈوکشن ٹو اکنامکس (Introduction to Economics) کا سلیس اور بامحاورہ اُردو ترجمہ جس میں معاشیات کے ابتدائی اُصول و مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ عثمانیہ میں ایف اے کلاس کے نصاب میں داخل ہی ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحہ۔ مجلد۔ منجانب جامعہ عثمانیہ شایع ہوئی ہی۔

(۵) **ہندوستانی معاشیات۔** مسٹر پرمتھ ناتھ بنرجی کی انگریزی کتاب انڈین اکنامکس (Indian Economics) کا سلیس اور بامحاورہ اُردو ترجمہ جسمیں مختصر طور پر ہندوستان کے معاشی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ عثمانیہ کی ایف اے کلاس کے نصاب میں داخل ہی۔ ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحہ مجلد منجانب جامعہ عثمانیہ شایع ہوئی ہے۔

(۶) **برطانوی حکومتِ ہند۔** انڈرسن صاحب کی انگریزی کتاب برٹش اڈمنسٹریشن ان انڈیا (British Administration in India) کا سلیس اور بامحاورہ اُردو ترجمہ جس میں مختصر طور پر حکومت ہند کا طریق بیان کیا گیا ہی۔ یہ کتاب بھی جامعہ عثمانیہ میں ایف اے کلاس کے نصاب میں داخل ہی۔ ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحہ مجلد۔ منجانب جامعہ عثمانیہ شایع ہوئی ہی۔

سلسلۂ منتخباتِ نظمِ اُردو

اِس سلسلہ سے اُردو شاعری کی ترقی کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ عجیب و غریب انتخاب ہے گویا شعر و سخن کے چمن کھلے ہوئے ہیں جن کے رنگ و بُو سے دل و دماغ بلکہ روح کو تفریح ہوتی ہے ملک میں یہ سلسلہ جس قدر پھیلے کم ہے ہر جلد کی ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحہ ہے۔

(۱) معارفِ ملّت۔ حمد نعت، مناجات اور اخلاقی و قومی نظموں کا گلدستہ جلد اوّل مجلد قیمت عہ

(۲) معارفِ ملّت۔ " " " (زیر ترتیب) جلد دوم مجلد قیمت عہ

(۳) جذباتِ فطرت۔ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے " عہ

(۴) جذباتِ فطرت " " " (زیر ترتیب) جلد دوم مجلد قیمت عہ

(۵) مناظرِ قدرت۔ اوقات مقامات مخلوقات اور واقعات کی تصاویر کا دلکش مرقع جلد اول " عہ

(۶) مناظرِ قدرت۔ " " " (زیر ترتیب) جلد دوم مجلد قیمت عہ

اعلان

الحمدللہ کہ منتخبات نظم اردو کی تین جلدوں کا یہ پہلا سٹ چھپکر ہدیہ ناظرین ہی۔ اسی پایہ کا دوسرا سٹ زیر ترتیب ہی جو عنقریب شایع ہوگا۔ اور امید ہی کہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

ہر سٹ میں معارف ملت، جذبات فطرت اور مناظر قدرت کی ایک ایک نئی جلد شامل ہی۔ انمیں سے کسی ایک یا دو جلد کے مقابل پورے سٹ کی فرمایش کو بلحاظ تعمیل ترجیح حاصل ہوگی قیمت فی جلد عہ اور فی سٹ للعہ مقرر ہی لیکن کم از کم ۲۵ سٹ کے خریدار کو فی سٹ ۸ر کمیشن ملیگا۔

ملنے کا پتہ

مؤلف

یا

محمد مقتدی خاں شروانی

علی گڈھ